U15038. 14-12-09

Title - NAYE ZAAVIYE (Part-1).

Creator - Murattiba Krishen Chandra.

Publisher - Maktaba Urdu (Lahore).

Date - N.A.

Pages - 241

Subjects - Urdu Afsana - Intikhab.

جلد اوّل

نئے زاویے

مرتّب

کرشن چندر

مکتبۂ اردو لاہور

63

یہ

سرخ ستارے

فیض کی نظمیں

رحیم وکریم .....

نوائے سلام

نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

اشرف المخلوقات

ہاں وہی عالم کہ تھا مدّت سے جس کا اشتیاق
آج پیدا ہو رہا ہے باہزاراں طمطراق
جن کو یہ ڈر ہے کہ یہ مولود ہوگا نا سعید
اُن کے اوجِ ذہن پر ہے پرتوِ وہمِ شدید
اور جو کہتے ہیں جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
کہہ دو چپ ہو جائیں، اِک جشنِ دِگر ہونے کو ہے
آج جو چھایا ہوا ہے زندگی پر یہ دھواں
اس دھوئیں میں پرفشاں ہیں سینکڑوں چنگاریاں
اِس شبِ جامد میں ہے صبحِ سیلِ احساسات ہے
اب بھی مانا رات ہے لیکن یہ پچھلی رات ہے
شب کے اس دھندلے افق سے باہزاراں آب و تاب
امن و آسائش کا طالع ہو رہا ہے آفتاب
تیز تلواروں سے ہو کیوں عصر تو چیں بر جبیں
یہ تو اِس موسم کے پھل ہیں تیز تلواریں نہیں
ان پھلوں کو، آدمی چکھ کر امر ہو جائے گا
آفتابِ حُسنِ اِنساں جلوہ گر ہو جائے گا
اِک انوکھی ضَو سے دُنیا جگمگا دی جائے گی
شمعِ برترِ آدمیت کی جلا دی جائے گی
کہہ رہا ہے صاف لفظوں میں زمیں کا غلغلہ
دردِ زِہ میں مبتلا ہے مادرِ لیل و نہار
ہِل رہا ہے یہ جو توپوں کی گرج سے آسماں
یہ تو ہے دراصل وضعِ حمل کی آہ و فغاں

جس کو ہے اسقاط کا اندیشہ وہ دیوانہ ہے
یہ حضورِ ارتقا اک حرفِ گستاخانہ ہے
جنگ کی بھٹی سے آنے ہی پہ ہے بادِ مراد
ارتقاء پائندہ باد و نوعِ انساں زندہ باد
آچکی ہے نقطۂ تکمیل پر حیوانیّت
دیکھ پیدا ہو رہی ہے اک جدید انسانیّت
پرتوِ تائید ہے اِس پردۂ تردید[1] میں
ایک صالح زندگی ہے معرضِ تولید میں
آرہا ہے تازہ وارث عالمِ احیاء کا
جلد تر اعلان کر دو اک نئے میلاد کا

[1] "تردید" کو اِس معنی میں استعمال کرنے کے باوجود میں اس کے ساتھ اب عطف و اضافت کو جائز سمجھتا ہوں۔

مہاجن

قد کی لمبائی سے اِک حد تک کمر جھولی ہوئی
سر پہ چُٹیا مُردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
دانت میلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغدار
ناک میں مونچھوں کے گچھے، پیٹ میں توندی کا غار
سامنے غلّے کے بورے، پشت پر الماریاں
بغبغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں
کہنیاں تکیے کے اندر وزن سے دھنستی ہوئی
چست صدری دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی
خوب لے لے کر ڈکاریں دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو پھلائے، توند سہلاتا ہوا
ہنس کے غوطے آپ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا
عذر کرتا پے بہ پے تیوری چڑھاتا بار بار
شدّتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار
کشتیِ ہستی کو جوئے سیم میں کھیتا ہوا
اُلٹی سانسیں سر بہی کے بار سے لیتا ہوا
رُخ کی تاریکی پہ زر کی سرخیاں چھائی ہوئی
بے حقیقت خاک سونا بن کے اِترائی ہوئی

کان کے بالے نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے
سود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہؤا
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہؤا

ہماری سوسائٹی

حوصلے سرنگوں، امیدیں شل
آرزو بار یاس سے بوجھل

نشہ، بجھتا ہؤا سا ایک شرار
کیف گرتی ہوئی سی اک دیوار

ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

شرم سے آپ آپ جولانی
ہر ہنسی شرمسار کھسیانی

خال و خط پر دھواں بناوٹ کا
کرب بالقصد مسکراہٹ کا

راجندر سنگھ بیدی

گرہن

روپو، شبو، کتھو اور منّا ــــــ ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دیے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل میّا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سُندرتا کا رسیلا حاسد تھا، گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات کو چاند گرہن تھا۔ سرِ شام چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے ــــــ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے ــــــ وہ سی نہ سکتی تھی ــــــ منہ سلا بچہ پیدا ہوگا، اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ــــــ شاید اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے۔ اور اپنے میکے خط لکھنے کا اُسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اُس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبے سے کانپ اُٹھتا۔ وہ میکے تھی تو آتے سسرال کا کتنا چاؤ تھا لیکن اب وہ سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا۔ لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کا میکہ ساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلہ پر تھا سمندر کے کنارے ہر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹہ کی مسافت کے بعد اس کے میکے کے گاؤں کے بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی ، چوکا برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ میا کہتی تھی گرہن سے پہلے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہیئے۔ ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدزیب فراخ نتھنوں والی ہٹیلی میا اپنی بہو جمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبرِ اعظم کی متوقع تھی۔ چار بچوں تین مردوں ، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی ———— دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی۔ پھر جانوروں کے لئے بھوسے کھلی اور چنے بھگونے چلی۔ خنے کہ اس کے کولھے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے اطمینانی مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر میا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ مونڈھا ہو جائے تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی میا اور کاشتوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک پُر شکم کُتیا کی طرح ٹانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر جمائی لیتی۔ اور پھر آیا وقت کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ننھے سے وزرخ کو سہلانے لگتی۔

اس خیال کے آنے سے کہ وہ بسنتیل کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ بسنتیل سارنگ دیو گرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ دیو گرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اور اس کے باوجود اسے کاشتکار

سے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کُتوں سے بھی بُرا سلوک ہوتا تھا۔ کاستھوں کو تو بچنے چاہئیں۔ ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کاستھ ہی گُل ودھو دکل کو بڑھانے والی ——— بہو) کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کپڑا گھر میں رنگینا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے۔ اور اسی لئے اُسے حمل کے شروع میں چاٹ اور اب پھل آزادانہ دیئے جاتے تھے ......

"دیور سے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے" ہولی سوچتی تھی "اور ساس کے کوسنے مار پیٹ سے کہیں بُرے ہیں۔ اور بڑے کاستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟ .... رسیلا کی بات تو دوسری ہے۔ شاستروں نے اُسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اُس چھری کا بھلا! .... لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور منّا کی بات ہی علیحدہ ہے ——— شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اُس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی ....."

.... راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں۔ اور ہولی سوز دل تھی۔ بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں ...... اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ شالوٹ کالا سا راکشس شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر آتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ منّا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموجود ہوا ——— کیوں نہ اس نے ابھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوتے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے میا آئی اور آتے ہی بولی۔

"بہو۔ . . . اناج رکھا ہے کیا؟"

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی "ہاں ہاں . . . . . . رکھا ہے ——— نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی میا . . . . "

"تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے، نواب جادی؟"

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی "جی مجھ سے اناج کی بوری ہلائی جاتی ہے کہیں؟"

میا لاجواب ہو گئی۔ اور یوں بھی اُسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ کے بچے کی زیادہ پروا تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی ———

"تم نے شرم کیوں لگا رکھی ہے ری؟ . . . . . . رانڈ، جانتی بھی ہو آج گہن ہے، جو بچہ اندھا ہو جائے تو تمہارے ابھی بلبوا اُسے پالنے چلے گی؟"

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ اور سب ہو جاتے لیکن رانڈ کی گالی اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ اُسے بڑبڑاتے دیکھ کر میا اور بھی بکتی جھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک نیلم [illegible] کے قریب سرمہ پیسنے کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اُس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر اپنے [illegible] کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پُرہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اب کے ولو ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھیڑا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن [illegible] دیا۔ اور اپنے دیور کو آواز دی۔

ن۔ م۔ راشد

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری ——

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں

چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں

صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند ——

رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں

تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں — من کی بگیا میں تو جھولے گی

منہ بسورے، رہگذاروں سے! — دل کی کلی واں نا پھولے گی

گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے دل کو توڑ

میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ ڈگر اہیں منہ کو موڑ

کُود جاؤں ساتویں منز — چلا ہے تجھ کو چھوڑ

انتقام

اُس کا چہرہ، اُس کے خدّ و خال یاد آتے نہیں
اِک شبستاں یاد ہے!
اِک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج!
دھات اور پتھر کے بُت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور!
اُن بتوں کی بے حسی پر خشمگیں
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پہ عکس
اُن فرنگی حاکموں کی یادگار سی رانی تو کو چھوڑ
جن کی تلواروں نے رکھا تھا دگر امیں منہ کو موڑ
سنگ بن . . . . چلا ہے تجھ کو چھوڑ
بل چلا ہے دیس سپاہی رانی تو کو چھوڑ

وہ
ہیں آلی یاد نہیں بھولے گی من کی بگیا میں تو جھولے گی
دم سے سانس یہاں تو لیگی دل کی کلی واں نا چھولے گی
پلک اُٹھا مت دل کو توڑ
مت ڈگر امیں منہ کو موڑ
چلا ہے تجھ کو چھوڑ

سے باغ کی تصغیر

جیل چلا ہے دیس سپاہی رانی تو کو چھوڑ

تو ہردے میں بسی ہے رانی — رگ رگ میں تو ہی ہے رانی
پریم جال میں پھنسی ہے رانی — تجھ پنّوں[1] کی سسّی ہے رانی
پریت دکھا مت تن[2] یہ سکوڑ[3]
مت دُکھ دا میں منہ کو موڑ
.... چلا ہے تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے دیس سپاہی رانی تو کو چھوڑ

پھر اچھے دن آئیں گے رانی — بچھڑے سب مل جائینگے رانی
دیس کے باسی گائینگے رانی — جھنڈوں کو لہرائیں گے رانی
دو ہی دنا کی بات ہے رانی میرا پلّا چھوڑ
مت دُکھ دا میں منہ کو موڑ
...... چلا ہے تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے دیس سپاہی رانی تو کو چھوڑ

[1] پنّوں اور سسّی پنجاب کے مجنوں و لیلیٰ [2] جسم [3] سکیڑ

جیبل چلاپٹ کرنے لگی۔ اور جب بہت میلا ہوگیا۔ تو دوپٹے کو سر پر سے اتار کر ہولی

...دیا اور بولی۔

تو بہر ڈے میں ڈال"

پریم جال مالی نہیں جانتی بیچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا

چلے۔ وہ کتیا ہے یا نیاب جادی۔ اس نے دوپٹہ دھونے میں ہی

مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہونے والا ہی ہوگا۔ بچہ دُھلے

ہوئے کپڑوں کی طرح چٹّہ رمُرسا پیدا ہوگا اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا بُرا سا چہرہ دیکھ کر

اُسے کوسنے دینے جائیں گے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے۔ . . لیکن قصور

اور بے قصوری کی تو بات ہی علیحدہ ہے کیونکہ یہ کوئی سننے کے لئے تیار نہیں کہ اس

میں ہولی کا گناہ کیا ہے سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سانزنگ دیوگرام یاد آگیا۔ کیس طرح وہ اسوج کے شروع میں

دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی۔ اور بھابی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے

سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی

تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں۔ اور

گایا کرتی تھیں ——

ماہندی تو ادی ما... رنگ گیو گجرات رے

...تت وہ ایک اچھلنے ک... ...ہی تھی: ایک بچہ...تانیہ سے

...سنتی تھی پو... چھوٹی تھی۔ نیاب جادی تو نہ

...را ہوئی۔ اس میں گجرات رنگا

۱ہ ہپّوں اور مستی پنجاب کے مجنوں دیلیلی ۲ہ ...ہم ۳ہ سکیٹر

تھی۔ اور اس کی سہیلیاں ـــــ وہ بھی اپنے فرضِ خواہوں کے پاس جاچکی ہوں گی۔

. . . . . سارنگ دیوگرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پن کیا جاتا ہے عورتیں اکٹھی ہوکر ندی کے گھاٹ پہ اشنان کے لئے چلی جاتی ہیں۔ پھول، ناریل تیاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منہ کھولے ہوئے آتی ہے۔ اور سب پھول پتّوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گزشتہ سال کرتے رہے ہیں اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتے ہیں۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور ـــــ ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے . . . . . ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گہنے جاتے ہیں۔ پھر دریا کی ایک لہر آتی ہے۔ اور پھر پاک وصاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے۔ پھر گھنٹے، ناقوس شنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور وغوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جھگڑے کی صورت میں گاتے بجاتے ہوئے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں۔ لنگڑے بیساکھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرم دل ہندو دان دیتا ہے۔ تاکہ غریب چاند کو چھڑا دیا جائے۔ اور دان لینے کے لئے بھاگنے والے بھکاری چھوڑ دو، چھوڑ دو، دان کا وقت ہے ـــــ چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند گرہن کے زمرہ میں آنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو ٹرے کا ستمر کے

پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ سر پھول بندر کی طرف اشنان کے لیے چلی۔

اب منّا، رمیلا، بڑا لڑکا سشیو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے۔ گجرے تھے اور آم کے پتّے تھے۔ اور بڑی امّاں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ ونشک کا فور تھا۔ جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے۔ اور ہولی ڈر رہی تھی ——— کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھو نے دھل جائیں گے۔

سمندر کے کنارے گھاٹ سے پون میل کے قریب ایک لانچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ سر پھول بندر کا ایک حصّہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ہینڈل غروب آفتاب کے خلاف تھی تھی۔ جس کے باعث سی سلوٹیاں بنا رہے تھے۔ ایک گہری ارغوانی سیاہی نے دامن شام کو رنگ دیا تھا۔ اور لانچ کے ایک کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب وار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک چرخی سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا نما رسّے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے پھر لانچ کی آخری سیٹی بجی تھی۔ پھر یہ مسارنگ دیوگرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں۔ . . . اور وہی اماں . . . کنوارپن اور گیا ناچ !

ہولی نے ایک نظر سے سشیو کی طرف دیکھا۔ سشیو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا ماتھا کیوں چوما۔ اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کی گالوں پر آ پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ آ چکا تھا۔ جہاں سے مرد اور عورتیں علیحدہ ہوتی ہیں۔ ہمیشہ کے لیے نہیں فقط چند گھنٹوں کے لیے . . . . اسی پانی نے گنگا میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی ہیں۔ پانی میں بھی کیا ٹیپا سرار لعبید الفہم ہے

آدمیوں کی

سعادت حسن منٹو

ل ہوتے ہی، بائیں طرف

نہ اور سوکھے ہوئے پھول

ایک سی تھان سے اتار کر فریم میں

پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا۔ تیل

کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا

N 70

باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔

چھالی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

نی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر

کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی

دی تھیں۔ اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔

بھی کبھی جب مادھو پونا سے چھٹی لے کر آتا تھا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے

نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے۔ جو اس نے خاص اسی کام کی غرض

سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا

تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونا سے آکر سوگندھی پر دھاوے بول دیتا ہے تو کہا

تھا ــــ اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے!

سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور دو چار روز ٹھہر کر تیرے ساتھ مزے اڑاتا

رہتا ہے۔ بلکہ تجھ ہی سے کچھ لے مرتا ہے ــــ سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر

آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے ــــ سات سال

سے یہ دھندا کر رہا ہوں، میں تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئے شہر کے مختلف حصوں میں سو روپے سے کر دس

روپے ٹک والی ایک سوا ایک چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا ——— "سالی
اپنا دھن یوں برباد نہ کر ——— تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری
ماں کا یار! ——— اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے
پیسے دبا دیا کر، اور جب وہ آیا کرے تو اس سے کہا کر ——— "تیری جان قسم مادھو، آج صبح
سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا، باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون
بسکٹ تو منگا، بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں! ——— سمجھیں؟ بہت
نازک وقت آگیا ہے میری جان ——— اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے
بازار بالکل مندا کر دیا ہے پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے بھگوان قسم
جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں
تو جی چاہتا ہے کہ تیری جون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے
کہا تھا "نیچے سے ان بم کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو ان کی سختائی
ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی "جمنا تو سب کو اپنی طرح سمجھتی ہے۔ دس روپے میں
لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تو تو سمجھتی ہے کہ باقی سب کے ساتھ بھی ایسا
ہی ہوتا ہوگا ——— کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ! ——— ارے ہاں کل کی
بات تجھے سناؤں، رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے
ہوا ——— جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی ——— ارے! وہ تو ڈرنے لگا! ———
سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹ کرکرا ہو گیا! ——— وہ سہم
سا گیا! میں نے کہا "چلو چلو، دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا! ———
بولا "روشنی کرو ... روشنی کرو ——— میں نے کہا "یہ روشنی کیا ہوا؟" ——— بولا "لائٹ
لائٹ!" ... ——— اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ "بھئی میں تو لا

نہ کر دوں گی!" —— اور یہ کہ میں نے اُس کی گوشت بھری ران کی [illegible] پہ جایا کرتی تھی۔ اور کر اُٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا "[illegible] آتی مردوئے!" —— وہ پلنگ پر آیا تو میں اُٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی! —— وہ [illegible] گھبرانے لگا —— تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی کبھی اندھیرا! کبھی اجالا! کبھی اجالا۔ کبھی اندھیرا! —— ٹرام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اُٹھ بھاگا —— سالے نے تیس رُپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا —— جمنا تو بالکل اُلّو ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کو ٹھیک کرنے کے لئے!"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اُس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بھی بتائے تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی —— "اگر آدمی شریف ہو۔ زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اُس سے خوب شرارتیں کرو۔ اَن گنت باتیں کرو۔ اُسے چھیڑو۔ ستاؤ۔ اُس کے گدگدی کرو۔ اُس سے کھیلو —— اگر داڑھی رکھتا ہو تو اُس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ —— اُس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے —— وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی —— ایسے مرد جو کہ چپ چپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں —— ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"

پر سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ وہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اُس کے گاہک بہت کم تھے انتہا درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اُسے یاد تھے اُس کے دماغ سے پھسل کر اُس کے پیٹ میں آ جاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث لکیریں پڑ گئی تھیں! —— ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اُسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اُس والے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں —— جب کوئی کُتیا بڑے دبے اعتنائی سے اُس کے پاس سے گزر جاتی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا!

روپے تک والی ایک سے زیادہ رہتی تھی۔ لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات ——— کوئی اپنا دھن بول —— اُس سے کہتا تو وہ جھٹ پگھل کر اپنے جسم کے دوسرے حصّوں میں مل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اُس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اُس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت بُری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے ——— ایسی تھکن جو اُنہیں جھنجھوڑ کر ——— اُنہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے! ———
ایسی نیند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آئے کتنی مزیدار ہوتی ہے ——— وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے! ——— کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو! اور ایسی ہونے نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو اوپر ہوا۔ نیچے ہوا۔ دائیں ہوا۔ بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا۔ اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص لطف دیتا ہے!

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اُس میں چھپ جایا کرتی تھی۔ تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اُس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ کتنا مزا دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ وہ اپنی ساری زندگی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں اور کبھی کبھی اُس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی اُن کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو کہ وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی۔ آنکھ مچولی ہی تو تھی! ——— کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی۔ اور کبھی کوئی اُسے ڈھونڈ نکالتا ——— بس یونہی اُس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اِس لئے کہ اُس کو خوش رہنا پڑتا تھا ——— ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اُس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا ———

سوگندھی جس کو بے شمار گُر مردوں کو ٹھیک کرنے کے لئے یاد تھے۔ اس بات کا بارہا تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ اِن مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی۔ اور اُن کے ساتھ

روکھے پن کے ساتھ پیش آتے گی ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی۔ اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا "سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں" ——— اور سوگندھی یہ جانتی بوجھتی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ——— پریم ——— کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگ پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اُس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اُس کے اندر داخل ہو اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کئے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تھا تو کئی بار اُس کے جی میں آتا تھا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اُسے اپنی گود میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اُس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ وہ ہر اُس مرد سے جو کہ اُس کے پاس آتا تھا محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ وہ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ بھی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اُس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اُس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھاپن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ——— ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا تھا "سوگندھی ——— تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور اُن کی راتیں اُس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اُسے وہ خوشی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ جس کی خواہش اُس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اُس کے دن بیتتے چلے جائیں۔ اُسے کون سے محل کھڑے کرنا تھا جو وہ روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اُس کا عام نرخ تھا،

جس میں سے ڈھائی روپیے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپیے آگے روز پل ہی جایا کرتے تھے۔ جو کہ اُس کی اکیلی جان کے لیئے کافی تھے۔ اور مادھو جب پونے بے بقول رام لال دلال سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیئے آتا تھا تو کیا وہ اسے دس پندرہ روپیہ خراج ادا نہیں کیا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اُس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلاّل ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں! ——— سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اُس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ ——— اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ ——— چھی چھی چھی ——— دس روپیے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپیے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات؟ اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے وہ چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں وہ چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ——— مجھے عورت چاہیئے پر تجھے کیا اس وقت اسی گھڑی مرد چاہیئے؟ ——— مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں! ——— تیرا میرا ناطہ ہی کیا! کچھ بھی نہیں ——— بس یہ دس روپیے جن میں سے ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے۔ اور باقی ادھر اُدھر بکھر جائیں گے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ——— تو بھی اُن کا بجنا سن رہی ہے۔ اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ——— کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ——— پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لیئے۔ یہ دھندا چھوڑ ——— میں تجھے خرچ دیا کروں گا ——— کیا بھاڑہ ہے اس کھولی کا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے

لٹکا رکھی تھیں بنا پوچھے کچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا ——— "سوگندھی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ——— اور پانی کا یہ گھڑا ——— دیکھو تو کتنا میلا ہے اور یہ ——— چیتھڑے۔ یہ چیندیاں ——— اُف کتنی بری باس آتی ہے۔ اُٹھا کے باہر پھینک۔ ان کو ——— اور تُو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ——— اور ——— اور ———"

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے کمرے میں بدبودار چیتھڑوں۔ میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا۔ اور نہ کبھی کسی نے اُس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اُس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا۔ "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ——— ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔" مادھو کتنا اچھا تھا۔ اُس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی کیا کھری کھری سنائی تھیں۔ اُس نے سوگندھی کو ——— اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔ "دیکھ سوگندھی، اگر تُو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تُو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ——— اِس مہینے کا خرچ میں تجھے پونہ پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ——— ہاں کیا بھاڑا ہے اِس کھولی کا . . . . ."

نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا کہ تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تُو نے؟ اور نہ مادھو نے

بھی سوگندھی سے پوچھا تھا: "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جبکہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں" ——— دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن سوگندھی خوش تھی جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جس کو اوف کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی ——— رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایک ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا۔ جو کہ بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ اس نے جھک کر پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ اس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اس نے دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا بھنا کر کہنے لگا "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا۔ یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ تو کہاں مر گئی تھی؟" پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا "اندر کوئی اور تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا "نہیں" تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی "تو دروازہ کیوں

نہیں کھولتی؟ ——— بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یہاں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا۔ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر لگا اور میرے ساتھ چل ——— باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ——— چل چل ایک دم جلدی کر۔" سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور رام لال آئینے کے پاس کھڑا ہو کر اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔

"رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا: "تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ "وہ بات نہیں رام لال۔ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ——— بہت پی گئی۔"

رام لال کے منہ میں پانی آ گیا۔ "تھوڑی بچی ہو تو لا ——— ہم بھی ذرا منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ "اگر بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ——— دیکھو رام لال۔ وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔"

رام لال نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں۔ تو گلی کی نکڑ تک چل ذرا ——— سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جبکہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ اسے کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کی ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی۔ جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس

کہا تھا "بہن تو چنتا نہ کر، میرا مرد پونہ سے آنے ہی والا ہے، میں اُس سے کچھ روپے لیکر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پونہ سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اُٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اُس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سُرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک لوٹا پی کر وہ رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی۔ بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کہ کھمبوں پر چڑھے تھے۔ پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آیا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ———— سوگندھی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن سا اُسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور دیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی تھی۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی۔ تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا "لیجئے وہ آ گئی ———— بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ اُسے دھندا شروع کئے ———— پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا "سوگندھی۔ اِدھر آ۔ سیٹھ جی بلاتے ہیں"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اُس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اِس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اونہہ!" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا۔ . . . .

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چلدی۔ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک بٹیری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر کیا ہوا تھا۔ اِس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو کہ ابھی تک اُس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی کیا؟...... کیا؟"

رام لال دلال کی آواز سُنائی دی "پسند نہیں کیا تجھے؟ —— اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیئے"

یہ سُنکر سوگندھی کی ٹانگوں میں اُس کی بانہوں میں —— اُس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر —— کہاں تھا وہ سیٹھ —— تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے مجھے پسند نہیں کیا —— اُس کی . . . . .

گالی اُس کے پیٹ کے اندر سے اُٹھی اور زبان کی نوک پر آکے رُک گئی۔ وہ آخر گالی کیسے دیتی۔ موٹر تو چل چکی تھی۔ اُس کی دُم کی سُرخ بتی اُس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی۔ اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ لال لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اُس کے سینے میں برمے کی طرح اُترا چلا جا رہا ہے۔ اُس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے "او سیٹھ۔ او سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی —— بس ایک منٹ کیلئے" پر وہ سیٹھ لعنتی ہے اُس کی ذات پر بہت دُور نکل چکا تھا؛

سنسان بازار میں وہ کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو کہ وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی۔ رات کے پچھلے پہر کی ہلکی ہلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑھی اور اُس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اِس ساڑھی کے چیتھڑے اُڑا دے۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ساڑھی ہوا میں لہرلہرا کر "اونہہ اونہہ" کہہ رہی ہے۔

گالوں پر اُس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی۔ جب اُسے خیال آیا کہ یہ سنگار اُس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اُسے پسینہ آگیا۔ اُس شرمندگی کو دُور کرنے کے لئے اُس نے کچھ نہ سوچا —— "میں نے اُس موئے کو دکھانے کے

لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے — پر — پر — یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلّال اور — اور — یہ بازار — اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک" — یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبّے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اُسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اُس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو کہ سنگار کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا، پسینہ آنے کے باعث اُس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا محسوس ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے معلوم ہوا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اُس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا۔ مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا سارا انگ دُکھنے لگے اور سر میں درد ہو۔ اُس کی ٹانگوں میں درد ہو۔ اُس کے پیٹ میں درد ہو۔ اس کی باہوں میں درد ہو — ایسا درد ہو کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کے دل میں کچھ ہوا — کیا یہ درد تھا؟ — ایک لمحے کے لیے اُس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا — یہ کیا تھا؟ . . . . لعنت! یہ تو وہی "اونہہ" تھی جو اس کے اندر کبھی سکڑتی تھی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رُک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ "رام لال دلّال کا خیال ہے کہ اُسے میری شکل پسند نہیں آئی — شکل کا تو اُس نے ذکر نہیں کیا ہے۔ اُس نے تو یہ کہا تھا: سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا؟ اُسے — اُسے میری شکل ہی پسند نہیں آئی — نہیں آئی تو کیا ہوا؟ — مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی — وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا۔ کتنی بری صورت تھی اُس کی

— کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ — کیا مجھے ابکائی آنے آتے نہیں رک گئی تھی؟ — ٹھیک ہے، پر سوگندھی! — تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا —
اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے — "اونہہ" — اس "اونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ — یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل — اونہہ — یہ منہ اور مسور کی دال — ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے — اس لونڈیا کی — اتنی تعریف کر رہا تھا تو — دس روپیہ اور یہ عورت — خچر کیا بُری ہے . . . . . "

سوگندھی یہ سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے — اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو — صرف ایک بار . . . . . وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ — سوگندھی — اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور — اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو کہ اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے۔ اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے — بالوں سے پکڑ کر وہ اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ اس کو مکے مارنا شروع کر دے۔ اور جب تھک جائے — جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے!

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ [illegible] یہی لیوں وہ بے جان ہے ہونے کا احساس طاری

کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا "تم روتی کیوں ہو؟ کیا ہوا ہے کہ تم ٹپکنے لگی ہو؟" ——————— آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک اُن آنسوؤں میں تیرتا رہا جو کہ اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ——— یہ آواز کہاں سے آئی! ——— سوگندھی نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا ——— ارے! یہ تو اُس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔ اُس کا دل ——— یہ کیا ہو گیا تھا اُس کے دل کو! ——— آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے ——— بھلا اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک گیا دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا ——— بالکل اُس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آکے رُک جاتا تھا "رات کٹی گن گن کے تارے" کہتا کہتا "تارے تارے تارے" کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سندر ہیں" ——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اُس کے دماغ میں کودا "یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے ——— کیا بھول گئی ہے کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے۔"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں میں آئینے میں وہ دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو کہ آج پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اُس کی شکل و صورت اُن تمام عورتوں کی سی تھی۔ جن کی میری گننس تھے گزر رہتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں شکل پسند نہیں آئی ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُسے

ایک دو راتیں بسر کرتا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اُس کے اعضا متناسب تھے کبھی کبھی نہاتے کبھی کبھی نہاتے وقت جب اُس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود اُنکی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اُس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ------- وہ بڑی ملنسار تھی۔ بڑی رحمدل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب کہ وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اُس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ آتارا تو بٹوے کو غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوا لے اُڑا تھا۔ بیچارہ بہت پریشان ہوا۔ وہ چھٹیاں گذارنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اُس کے پاس واپس جانے کے لئے کرایہ کے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اُسے اُس کے دس روپے واپس دے دئیے تھے ------- "مجھ میں کیا بُرائی ہے ؟" سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ۔ لوہے کے کھمبے۔ فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اُکھڑی ہوئی بجری ------- ان سب چیزوں کی طرف اُس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں جو اُس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اُس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں۔ اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی تائید کرے ------- کوئی ------- کوئی ------- اُس وقت کوئی اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ "سوگندھی کون کہتا ہے کہ تو بُری ہے جو تجھے بُرا کہے۔ وہ آپ بُرا ہے" ------- نہیں۔ یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کسی کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا۔ "سوگندھی تو بہت اچھی ہے۔"

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اُس کی تعریف کرے۔ اِس سے پہلے اُسے اِس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی تھی۔ جیسے وہ اُن پر اچھے ہونے کا احساس طاری

کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ کیوں "ماں" بن رہا تھا .... وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ ——— اُس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اُس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔ اپنے گرم گرم گال! اور اُس کی ساری سردی چوس لے!

تھوڑی دیر کے لیے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ۔ لوہے کے کھمبے فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اُس کے آس پاس تھی بھید بھری کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے۔ اور اُس کے اوپر جھکا ہوا آسمان کبھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے ———

لیکن اُس کے اندر یہ گڑبڑ کیا تھی؟ ——— وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی تپش محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے ——— اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اُس کے اندر اُبل رہا ہے۔ اِن کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ——— کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بمبے کے پاس کھڑی تھی ... ہوا کے تیز جھونکے سے اُس بمبے کی آہنی زبان جو کہ اُس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے۔ کھڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اُس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اُسے کچھ نظر نہ آیا ——— اُس کی کتنی زبردست خواہش تھی۔ کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور .... اور ———

"نہ آئے ——— بلا سے .... میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں ....

گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ اِن جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے مفت کی دردسری ہی تو ہے .... چل سوگندھی گھر چل .... ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا

پی اور تھوڑا سا بام مَل کر سو جا ——— فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔
——— سیٹھ اور اُس کی موٹر کی ایسی تیسی ———"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کے سینے پر سے بوجھ ہلکا ہو گیا اور اُس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا۔ اُسی طرح اب ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف جب وہ چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اُس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

جب وہ اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اُس کے رُوئیں رُوئیں پر چھا گیا ——— اُس کے قدم پھر بوجھل ہو گئے۔ اور وہ اِس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بُلا کر، باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اُس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اُسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ——— اُس سیٹھ نے ——— پرماتما کرے . . . . . سوگندھی نے چاہا کہ اُسے کوئی بد دعا دے مگر سوچا بد دعا سے کیا بنے گا، مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اُس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ——— اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر وہ بے چین رہتا ——— کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی ——— "یہی لینے آیا تھا تو؟ ——— لے، دام دیئے بنا لے جا اسے ——— پر جو کچھ کہ میں ہوں، جو کچھ کہ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ———"

انتقام لینے کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اُس سیٹھ سے ایک بار ——— صرف ایک بار ——— اُس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے ——— نہیں یہ نہیں۔ یہ کرے ——— یُوں اُس سے انتقام لے۔ نہیں یوں نہیں۔ لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اُس کا دوبارہ ملنا بالکل محال تھا تو وہ

سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی بس صرف ایک چھوٹی سی گالی۔ جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں پر جمی رہے "

اسی ادھیڑبن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے اُس نے چابی نکالی اور تالا کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تالا نہیں تھا! سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ——— صبح کی سیر تندرستی کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اُٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی۔ اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے ——— وکٹوریا گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو ——— کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اُس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی۔ تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اُس میں حصہ لے ——— چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی اپشت پر اُس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا!

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی "میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی"۔ مادھو چلتے ہوئے اُلٹ پلٹ گیا "انتظار! ——— تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں؟" سوگندھی کے دوسرے ہی لمحے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ اُن پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی "میں

نے رات تجھے سپنے میں دیکھا —— اُٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سوچی نے کہا چل گھوم آ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ "

مادھو خوش ہو کر بولا "اور میں آ گیا —— بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہے —— تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا "چار بجے کے قریب"

مادھو کرسی پر سے اُٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا "اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے دیکھا —— جیسے تو پھولوں والی ساڑھی —— ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں —— کیا تھا تیرے ہاتھوں میں! —— ہاں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی —— لے یہ تھیلی —— ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟" —— سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اُٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رُخ کیا —— کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے؟ —— بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو سب انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے —— تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دباؤں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے —— ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں باہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اس لہجے میں جو کہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی "مادھو یہ کیس ہوئے نے تجھ پر کیس کیا ہے جیل وہل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے —— بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر اگر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے —— جان بچی لاکھوں پائے —— بس بس اب جانے دے تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے —— مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سُنا —— کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے —— واپس کب جائے گا تو؟

سی گالی دے۔ سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اُس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور پچکارتے ہوئے کہا: "دوپہر کی گاڑی واپس جانا پڑے گا ــــــ اگر شام تک سب انسپکٹر پچاس روپے نہ تھمائے تو . . . . . زیادہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں، پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اُٹھی اور اُن چار تصویروں کے پاس گئی جو کہ دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں پڑی تھیں۔ تصویر اتروانے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی: "ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا!" کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اُسے بہت تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی ــــــ اُس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کو سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اُٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا: "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں طرف کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی: "اس کی ــــــ میونسپلٹی کے اس داروغے کی . . . . . . ذرا دیکھو تو اس کا تھوبڑا ــــــ کہتا تھا ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی ــــــ اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال!" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی!

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی تو سوگندھی نے

کہا "رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی لے جائے گی"
اب کی بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی۔ جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی تھی۔
مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا، پھر ہنسا "ہی ہی ہی . . ."
سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا "اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے؟ ——— بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا . . . کیوں مادھو؟"
مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور ہنسا "ہی ہی ہی . . . ."
ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے آدمی کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا۔ جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔
زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ ایک کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا "اچھا کیا ——— مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"
آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا——— پر میں پوچھتی ہوں کہ تجھ میں ایسی کونسی چیز ہے جو کسی کو پسند آسکتی ہے ——— یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے۔ یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟ ——— تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ . . . . . پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو اس نے چھپا رکھے تھے . . . . . آج کل زمانہ ہی ایسا ہے کہ جو عیب چھپائے وہی بُرا ———"
مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور

پیدا کر کے کہا، "دیکھ سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کر دیا ہے ——— اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ——"

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا: "اگر تو نے پھر اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ——— اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونہ پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ——— ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو جھینپ گیا!

سوگندھی نے کہنا شروع کیا: "میں بتاتی ہوں ——— پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا ——— اور دس روپیہ میرا بھاڑا ہے ——— اور جیسا کہ تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپوں میں میں نے وہ چیز دینے کا وچن دیا ہے جو میں دے ہی نہیں سکتی۔ اور تو وہ چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا ——— تیرا میرا ناطہ ہی کیا تھا، کچھ بھی نہیں، بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی تھی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری ——— پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے۔ آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں ——— یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گذری اور اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا: "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ "یہ چیتھڑے، یہ چیندیاں ——— اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کے باہر پھینک انکو۔۔"

مادھو چلایا: "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا: "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے یہاں؟ ——

تیری ماں ... جگدیو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا گبرو جوان ہے
جو میں تجھ ... رکھی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتنے رکیے مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں
تیری دیبل ... ——— بھک منگے، تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے ———
میں پوچھتی ... ہوں ... کون ؟ ——— چور ہے یا گٹھ کترا ؟ ——— اس وقت تو
سے ... نے آیا ہے ؟ ——— بلاؤں پولس کو ؟ ——— پونہ میں تجھ
پر کیس ... تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں ———"

مادھو ... ہوتے ... پیچھے وہ صرف اس قدر کہہ سکا " سوگندھی تجھے
کیا ہو گیا ہے ؟"

" تیری ماں ... ——— تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا ———
بھاگ یہاں سے، ورنہ ——— " سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا
جو کہ سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھ کر سو رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ
اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی ... زور سے ہنسنے
لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی
دی " خبردار ——— وہیں پڑی رہنے دے ——— پونہ پہنچتے ہی میں اس کو
منی آرڈر کر دوں گی " یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔
اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا سیڑھیاں
اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا تو اس کے قدموں
میں بیٹھ کر اپنے کان پھڑپھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک
ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا۔ اسے ایسا معلوم
کہ ہر شئے خالی ہے ——— جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب
پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے ۔ ۔ ۔ یہ خلا

سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے بہت تکلیف دے رہا تھا [illegible] کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت [illegible] خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ اِدھر وہ [illegible] پکڑتی تھی۔ اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

چیتھڑے
مادھو
سوگندھی

ایس۔ ایچ۔ واتسائن

چڑیا گھر

رما نے تنک کر کہا ——— "ہاں اور تمہیں کیا سوجھے گا۔ کالج سے چھٹی ہوئی، آتے پھیل کر پڑ رہے۔ نہ ہوئی چھٹی تو شام کو سینما جا کر اونگھ لیا، پھر جب میں کہہ دوں گی کہ مرد تو شادی اس لیئے کرتے ہیں کہ رسوئیا، کہارن کو تنخواہ نہ دینی پڑے" تو کہیں گے بے انصافی کرتی ہو میں کہتی ہوں راجہ کیا روز روز مرتے ہیں؟ آج سوچا کہ چھٹی ہوئی تو چلو کہیں گھوم آئیں لیکن انہیں کیا گھومنے سے ——— وہ بھی میرے ساتھ! یہ تو لیٹ کر حقہ گڑگڑائیں گے۔ ہاں ہوتی کوئی میم صاحب ———"

میں نے بات ختم کرنے کے لیئے کہا: "اچھا بھئی، چلتے ہیں لیکن تم کپڑے تو بدلو، میں بھی ذرا پانچ منٹ سگار پی لوں۔"

سگار کے نام سے رما پھر بھڑک اٹھی لیکن میں نے اس کی کچھ کہنے سے پہلے ہی جڑ دیا: "وہ پیلی ساری پہننا، کالے کنارے والی۔ تم تو کبھی اچھا ک

اب —"

رما نے اندر ہی اندر پگھل کر لیکن باہر سے اور سخت بن کر کہا۔"تم لا کر بھی دو کبھی کچھ!"

اور یہ چلی گئی۔ میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

بات یہ تھی کہ اُس روز اپنے راجہ صاحب کے خسر کے راجہ کے انتقال کی وجہ سے کالج بند ہو گیا تھا اور میں لوٹ آیا تھا۔ جی میں آیا گھر چل کر پڑے پڑے اونگھا جائے۔ ایسا موقعہ بھی کب ملتا ہے۔ اتوار کو چھٹی ہوتی ہے۔ وہ پڑھائی کے نوٹ رگڑتے رگڑتے برباد ہو جاتی ہے، لیکن شریمتی کو یہ کب منظور؟ وہ ہمیشہ یہی اصرار کرتی ہیں "چلو گھومنے چلیں" صبح ہو، شام ہو، دوپہر ہو، بارش ہو گرمی ہو اُنہیں ایک ہی دھن رہتی ہے "چلو گھومنے چلو" اور گھومنے بھی کہاں؟ باغ نہیں، ندی پر نہیں، شہر میں نہیں — چلو چڑیا گھر! اُٹھنے لگے گی تو بابا! اول بھی سامنا نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ٹیسٹ بالکل بچوں کا سا! مجھے چڑیا گھر کے نام سے چڑ ہے۔ اِسی لئے آج تک کبھی رما کی بات مانی نہیں ہے چڑیا گھر بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟ بدبو سے ناک سڑتی ہے۔

آج بھی مجھے امید تھی، وہ کہے گی، چلو چڑیا گھر دیکھ آئیں۔ اُس نے کہا نہیں اسی لئے میں نے گھومنے چلنا منظور کر لیا۔ حالانکہ اب بھی مجھے یقین نہیں تھا۔ کہ اب بھی وہ راستے میں نہیں کہہ بیٹھے گی کہ چلو ادھر چلیں، اور ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ نہ لے چلے گی!

میں آرام کرسی میں پڑا سگار کے کش لینے لگا۔ سگار بڑھیا تھے — حالانکہ اِس بار رما خرید کر لائی تھی۔ اِس مہینے سے گھر کا خرچ چلانے کا ذمہ اُس نے لیا تھا۔ اور شرط تھی کہ مجھ سے اچھا چلائے گی اور کفایت سے۔

میں اونگھنے لگا۔ رما سے ہارنا بھی کچھ میٹھا میٹھا سا لگنے لگا۔

× × × × × × ×

" —چلو چلو چلو—

" بیٹھا۔

چڑیا گھر

"کہاں چلیں؟"

"چڑیا گھر، اور کہاں۔ جانے کب سے کہہ رہی ہوں" کہہ کر رما میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ حوّا نے جب آدم کو وہ ممنوع پھل کھانے کو کہا، تب بھی وہ مسکرائی ہو گی ——— اور حوّا کے پاس وہ کالے بورڈر والی پیلی ساڑی بھی نہیں تھی۔ . . . . .

میں نے ایک لمبی سانس لیکر کہا ——— "چلو"

باہر بادل چھائے تھے۔ ہوا چل رہی تھی، موسم اچھا تھا۔ ہم لوگ تانگے میں بیٹھ کر چڑیا گھر پہنچے۔ رما نے بٹوا کھول کر چار آنے کی مونگ پھلی اور چنے لئے اور بولی ——— "جانوروں کو کھلائیں گے"

میں مسکرا دیا اور آگے بڑھا۔

"ادھر نہیں بابو! ادھر!" میرے کندھے کے بالکل قریب کسی نے کہا۔ میں نے گھوم کر دیکھا ایک ڈیل ڈول والا بڈھا خاکی کپڑے پہنے کھڑا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا ——— "ادھر نہیں بابو! ادھر!"

میں نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں گائڈ ہوں میرے ساتھ آیئے، میں دکھاؤں گا" اور وہ آگے چل پڑا۔ ہم بھی بے دلی سے اس کے پیچھے ہو لئے ——— میں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ صرف رما ہی ہو۔ . . .

میں نے کہا ——— "چڑیا گھر میں گائڈ ——— آج تک کوئی سنا نہیں ———"

اس نے بات کاٹ کر کہا ——— "میں چڑیا گھر کی ایک ایک بات جانتا ہوں، آپ کو وہ سب بتاؤں گا کہ پھر کبھی چڑیا گھر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی" کہہ کر وہ بڑی تیکھی نظر رما کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

میں نے دل ہی دل میں ہنس کر کہا ——— "بڈھا بڑا اکھڑ ہے!"

اور اس نے جیسے میرے خیالات پڑھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا ——— "ہاں بس سمجھ

لیجیے کہ میں چڑیا گھر کی روح ہوں"

بندر

"یہ آپ دیکھتے ہیں؟"

دو کٹگھروں میں بندر بند تھے۔ پانچ چھ طرح کے ایک میں، وہی پانچ چھ طرح کے دوسرے میں۔ کچھ نیچے ریت میں، کچھ بیچ میں گڑی ہوئی پانی کی ناند کے کنارے، اور کچھ دونوں کٹگھروں کے بیچ جنگلے سے لگ کر بیٹھے تھے۔ زیادہ تر اوپر آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے۔

رما نے مونگ پھلی پھینکی، دو ایک نے سست چال سے آکر اٹھائی، تب میں نے دیکھا کہ اکثر بندروں کے جسم پر کھجلی ہو رہی ہے، کتنوں کے بال جھڑ گئے ہیں۔ اور کچھ نے بدن چھیل چھیل کر زخم کر لیے ہیں۔ یکایک کراہت سے متاثر ہو کر میں نے کہا —— "چلو چلیں!"

گائیڈ نے کہا —— دیکھ لیا آپ نے؟ اب میں دکھاؤں۔ آپ نے پہچانا، دو کٹگھڑوں کے بندروں میں کچھ فرق ہے؟ ایک میں نر ہیں ایک میں مادہ۔ یہ ہمالیہ کے بندر ہیں، یہاں کی گرمی میں ان کا رہنا مشکل ہے لیکن گیان کے لیے یہ تکلیف ضروری ہے۔ آدمیوں کے گیان کے لیے جانوروں کا سکھ کیا چیز ہے؟ یہاں سب کو کھجلی ہو گئی، اور جو بچے پیدا ہوتے وہ اور بھی مریض ہوتے۔ ریت میں پڑے وہ سنسان نظروں سے اس پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ ان کے جسم سے نکلی ہوئی پیپ سے یہ جگہ سڑ رہی تھی۔ ایک دن راجہ صاحب آئے، چڑیا گھر کے صاحب نے ان سے کہا کہ ان بچوں کو گولی مار دینی چاہیے لیکن راجہ صاحب کو یہ منظور نہیں تھی، انہوں نے انتظام کیا کہ اب ان کے بچے نہیں ہونے دیئے جائیں اور ہر سال دو نئے بندر خرید کر یہاں رکھے جائیں تاکہ نمائش ٹھیک رہے تبھی سے نر اور مادہ الگ کٹگھروں میں رکھے جاتے ہیں، دیکھیے:

میں ایک نظر سے بچوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو بیچ کے جنگلے کے پاس بیٹھے تھے۔

ان کی کاہلی، مونگ پھلی کے لئے ان کی نفرت اور بے پروائی ایک خوفناک بات بنکر میرے دل میں سما رہی تھی . . . . .

رما نے میری کہنی پکڑ کر کہا ـــــ آگے چلو

یکایک جی چاہا، رما کے اس لمس کو کہنی کے دباؤ سے باندھ لوں، جدا نہ ہونے دوں اور وہاں سے بھاگ جاؤں . . . . میں نے کہا "چلو چلو!" مگر مسحور نظر بندروں سے نہیں ہٹی جب تک کہ بڈھے نے کہا نہیں ـــــ "ابھی بہت دیکھنا ہے آپ کو!"

ہاتھی

رما بولی ـــ "ارے چڑیا گھر میں ہاتھی بھی رکھا ہے!"

میں نے کہا ـــ "ہاں ادھر ہاتھی بھی ایک عجیب چیز ہے نا ـــ"

گائیڈ بیچ میں بات کاٹ کر کہنے لگا ـــ "یہ ہاتھی ہاتھیوں میں بھی عجیب ہے اس کی ایک تاریخ ہے۔ یہ پہلے راجہ صاحب کے ذاتی فیلینی کا سب سے تگڑا ہاتھی تھا۔ سال میں دو بار جب دنگل ہوتا تھا تو راجہ صاحب اسے لڑاتے تھے۔ باہر بھی لڑنے بھیجتے تھے۔ لیکن بہت زیادہ لڑنے سے کھوپڑی پر زور پڑا اور دونوں آنکھیں اندھی ہو گئیں تب راجہ صاحب نے پانچ سو روپے میں اسٹیٹ کو بیچ دیا۔ اور چڑیا گھر میں رکھدیا۔ اب اس کے ہلتے ہوئے سر، لٹکے ہوتے دانت اور جھریاں پڑے ہوئے جسم کو دیکھ کر آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ یہ کیسا مدوت رہا ہوگا۔ لیکن دیکھئے یہ کہہ کر اس نے ہاتھی کے پیٹ کے پاس لٹکتی ہوئی چمڑی کو ہلا کر کہا ـــ یہ دیکھئے، فٹ فٹ بھر لٹک رہی ہے۔ اس میں اگر گوشت اور پٹھے ہوتے تب .

میں نے تائید کرتے ہوئے کہا ـــ "ہاں واقعی ہے ہاتھی ہی"

"اب اسے چوتھائی خوراک پر رکھا گیا ہے۔ خرچ بہت ہوتا ہے نا! صاحب نے اسے بھی گولی مار دینے کی رائے دی تھی۔ اور راجہ صاحب نے پوچھا بھی تھا کہ دانت اور

چڑیا گھر

ہڈی بیچنے سے کیا آمدنی ہوگی لیکن معلوم ہوا کہ کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی
کہا گیا کہ یہ راجہ صاحب کی شان کے خلاف ہوگا، لوگ کہیں گے کہ ساری عمر تو بچلے
کو لڑاتے رہے اور بوڑھا ہوگیا تو تھوڑے سے چارے کے لالچ میں گولی مار دی۔ ان
دونوں باتوں پر دھیان رکھ کر راجہ صاحب نے دھرم کا خیال کرکے تجویز نامنظور کر دی
رما نے مٹھی بھر مونگ پھلی بڑھائی۔ ہاتھی شاید بو سے پہچان گیا کہ کھانے کو کچھ دیا
جا رہا ہے لیکن سونڈھ سے ٹٹول کر بھی نہیں پہنچ سکا۔ تب یکایک اس نے سونڈھ لٹکا
دی اور کیچڑ بہتی ہوئی آنکھیں خلا میں جما کر رہ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو ... بھوک سے تو مرنا ہے
کھایا تو کیا، نہ کھایا تو کیا۔ . . . .

میرے دل میں اپنے سابقہ پروفیسر ڈاکٹر کرشن کی تصویر پھر گئی، جو بیمار ہو جانے کی وجہ
سے چھٹی نہ پا سکے تھے اور برخواست ہوگئے تھے۔ . . . وہ بھی ایسا ہی بانکا جوان تھا۔
لیکن جب اس نے مجھ سے کہا تھا ــــ "میرا کچھ بھروسہ نہیں، بیمہ کی رقم وصول کرنے
میں میری بیوی کی مدد کرنا، ریاست کی کمپنی ہے . . ." اور چپ ہو کر میری طرف
دیکھنے لگے تھے تب . . . . . .

میں نے رما سے کہا تم نے کیا ہاتھی بھی نہیں دیکھا، اور بانہہ پکڑ کر کھینچ لے چلا۔

طوطے

گائیڈ بولا ــــ "چلئے ادھر"
میں نے کہا ــــ "دکھانے کا کوئی طریقہ بھی ہے، ہاتھی کے بعد طوطے ــــ"
وہ بولا ــــ "میرا طریقہ آپ ابھی نہیں سمجھتے، میں کتابی کیڑا تو ہوں نہیں، میں
آپ کو چڑیا گھر کے جانور نہیں ان کی آتما دکھا رہا ہوں۔ اس روح کا تجزیہ۔ آپ میری
کہانی میں پائیں گے"
بڈھے میں کچھ عجیب تاثر تھا، ہم پیچھے ہو لئے۔

طوطے اونگھ رہے تھے، گانڈ نے چٹکی بجاکر انہیں جگایا۔ رما بلانے لگی ——
"مٹھو، میاں مٹھو!"

طوطے رما کی طرف دیکھتے رہے، رما نے دانے اندر ڈال دئے مگر طوطے وہیں بیٹھے رہے۔ ایک نے چڑ چڑی سی آواز میں کہا —— ٹیں ٹیں! گویا یہ جتلا رہا ہو کہ تم اپنا کام کر چکے، اب جاؤ، ہم کھا لیں گے!

گانڈ بولا —— "یہ طوطے اب صبح یا شام کو ہی بولتے ہیں۔ جب پہلے پہل یہ چڑیا گھر کے لئے خریدے گئے تو خوب بولتے تھے لیکن خرید کر اندر رکھے جاتے ہی وہ چپ ہو گئے۔ بلانے جلانے، بلانے پچکارنے اور بھوکے رکھنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب راجہ صاحب نے اس سوداگر کو بلایا جس سے طوطے لئے گئے تھے اور جواب طلب کیا۔ سوداگر نے جگہ دیکھ بھال کر عرض کی —— "حضور یہ طوطے جنگل کے رہنے والے ہیں، آسمان کے ڈکیت ہیں، اس لئے ان کا گانا رونا، سکھ دکھ سب آزادی پر منحصر ہے۔ یہاں انہیں اس کی جھلک بھی نہیں ملتی۔ آپ ان کے رہنے کے لئے ایسی جگہ بنوائیے جہاں سامنے دیوار نہ ہو۔ آگے کھلا نظارہ ہو، یہ طلوع آفتاب بھی دیکھ سکیں اور غروب بھی یا اس آزادی سے ان کا رشتہ نہ ٹوٹے جو ان کی زندگی ہے۔ راجہ صاحب کو بات جچی تو نہیں لیکن طوطے خوبصورت تھے، چار سو روپے میں خریدے گئے تھے۔ اس لئے سوداگر کے کہنے کے مطابق عمارت کھڑی کر دی گئی۔ جب طوطے اس میں رکھ دئے گئے تو ایک دن راجہ صاحب اس سوداگر کو ساتھ لے کر صبح صبح دیکھنے آئے۔ راستے میں راجہ صاحب کہتے آئے کہ صرف رہنے کی جگہ تیار کرنے میں ہزار سے زیادہ روپیہ خرچ ہو گیا ہے . . . . خیر۔ انہوں نے پہنچ کر دیکھا، سورج کی پہلی کرن پڑتے ہی طوطوں میں زندگی آ گئی ہے۔ آگے کی طرف ٹک ٹک کر، گردن جھکا کر اپنی گول گول ایک ٹک آنکھوں سے مشرق کی سرخی کو گویا ایک بے چین تمنا سے پی رہے ہیں، اس میں سے کچھ فرحت پا رہے ہیں جس سے ان کے بازو پھڑ پھڑا تو نہیں رہے، ذرا سے

اُٹھ کر کانپ رہے ہیں، سارا بدن کانپ رہا ہے، یکایک وہ بھری ہوئی آواز سے بھرے ہوئے دل سے چیخ اُٹھے ——— کچھ لمحوں کے لئے غل سا مچ گیا . . . . پھر سورج پورا نکل آیا اور طوطے آہستہ آہستہ چپ ہو گئے، صرف کبھی کبھی کوئی جیسے ایک بھولی ہوئی یاد کو لے کر پکار اُٹھتا، ٹیں !

راجہ صاحب خوش ہو کر بولے ——— "بولتے تو ہیں"

سوداگر نے باچھیں کچھ کھلا کر کہا ——— "راجہ صاحب میرے طوطوں کی ایک ایک آواز ہزار روپے کی ہے !"

ذرا چپ رہ کر گائڈ پھر بولا ——— اس حساب سے یہ طوطے اب تک کروڑوں روپے کما چکے ہیں !"

میں نے کہا ——— "ترکیب تو اچھی رہی"

"اچھی ؟ اجی صاحب غضب کی رہی ترکیب ! آپ دیکھیں، یہ کہاں عمل میں نہیں آتی ؟ آپ دن بھر کالج میں لکچر جھاڑتے ہیں، کیا وہ آپ کا فرض ہے ؟ آپ کو بھی دور کہیں پر کچھ نظر آتا ہے ——— پنشن، ایک اپنا گھر، باغیچہ میں دھنیا پودینہ کی اپنی کھیتی وغیرہ وغیرہ یا اسی آسرے تو ———"

میں نے کہا ——— "رہنے دو اپنا فلسفہ، ہمیں چڑیا گھر دیکھنا ہے"

اُس نے ذرا بھی بُرا مانے بغیر کہا ——— "یہ چڑیا گھر نہیں تو اور کیا ہے ۔ اور آپ اُن سے پوچھ کر دیکھیے" اُس نے رما کی طرف اشارہ کیا ——— یہ روٹی پکاتی ہیں، گھر سنبھالتی ہیں، شاید ہار مونیم بجاتی ہیں، وہ سب کس لئے ؟ ان کے دل میں بھی کوئی خواب ہے یا ———"

رما نے غیر ضروری غصّے سے بھبھک کر کہا ——— "چپ رہو تم !" لیکن میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں ایک گھٹا سی گھر آئی ہے جسے میں نہیں سمجھ سکا ۔

شیر

رما کی پھٹکار کا شاید اُس پر کچھ اثر ہوا۔ تبھی جب ہم شیر کے کٹگھرے پر پہنچے تو اُس نے آہستہ سے کہا ——— "وہ دیکھئے" اور کٹگھرے کی سیخوں سے لگے ہوئے ایک وارڈ کی طرف ہمیں متوجہ کیا۔

ہم نے پڑھا ——— "یہ شیر راجہ صاحب نے چڑیا گھر کے لئے پیش کیا تھا۔ گجرات کے جنگلوں میں یہ راجہ صاحب کی بدولت ہی پکڑا گیا تھا"

ہم نے شیر کو دیکھ لیا، وہ ریت میں گڑھا سا کھود کر اُس میں بسی ہوئی نمی کی خنکی پانے کے لئے اُس سے ٹھوڑی لگائے ہانپ رہا تھا۔ اُس کی ادھ کھلی آنکھیں بے بسی سے ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھیں، گویا کہہ رہی ہوں' میں بھی قید میں ہوں ورنہ تم لوگ کیا چیز . . . . اُسے دیکھ کر ہم لوگ آگے بڑھنے لگے

گائڈ نے کہا ——— "راجہ صاحب کی مردانگی کی کہانی ہے، شاید آپ کو کچھ دلچسپی ہو۔ اُس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو" خود مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے" ہم کہانی پر للچا گئے۔ میں نے کہا ——— "کہو"

"راجہ صاحب کے یہاں اکثر غیر ملکی شکاری آتے رہتے ہیں' اور غیر ملکی ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ راجہ صاحب اُن کے عہدے کے مطابق ایک یا دو شیر مروائیں۔ اِس لئے اب شیر بہت کم ہو گئے ہیں۔ لیکن دسہرے کے دنوں میں راجہ صاحب کا ایک شیر مارنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اُس کی کچی کھال پر کھڑے ہو کر راجہ صاحب دربار میں مجرا لیتے ہیں۔ تو اِس بار بھی تیاری ہوئی۔ مچان بندھے۔ اور شکار پارٹی چلی۔ لیکن بہت ڈھونڈنے اور ٹوہ لگانے پر بھی شیر نہیں ملا۔ صرف ایک بڈھے نے یہ خبر دی کہ جنگل میں ایک تالاب کے پاس شیرنی نے بچے دئے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ ماند میں پڑی رہتی ہے۔ تب نیا مچان بندھا۔ نئے سرے سے شور مچایا گیا کہ

شیرنی باہر نکلے۔ آخر راجہ صاحب نے اپنے دو نوجوان شکاریوں کو حکم دیا کہ وہ ماند کے پاس جائیں اور شیرنی کو بھڑکائیں۔ اُنہیں اپنی حفاظت کے لئے بندوقیں دے دی گئیں۔ اور کڑا حکم دیا گیا کہ شیرنی پر فائر نہ کریں، اُسے راجہ صاحب کے لئے ہی آنے دیں وہ ماند کے پاس گئے اور کچھ دور سے اُنہوں نے ایک بڑا سا پتھر ماند کی جانب لڑکایا۔ شیرنی تڑپ کر باہر نکلی تو شکاری بھاگے۔ ایک تو نکل گیا، لیکن دوسرے پر شیرنی کا پنجہ پڑا اور وہ گر گیا۔ بندوق اُس کے ہاتھ میں تھی اور شاید وہ گولی چلا بھی سکتا، مگر راجہ صاحب کا حکم نہ تھا! راجہ صاحب نے تین چار فائر کئے اور شیرنی مر گئی۔ گھائل شکاری کو اٹھا لے گئے راجہ صاحب نے اپنے ذاتی ڈاکٹر سے اُس کا علاج کرایا مگر وہ ساتویں دن مر گیا۔"

میں نے کہا —— "لیکن یہ شیر! اس کی تو بات ہی نہیں ہوئی"

"ہاں شیرنی کے دو بچے پکڑ لئے گئے۔ راجہ صاحب نے خود ماند میں گھس کر پکڑوائے اُن میں سے ایک یہ شیر ہے جو آپ دیکھتے ہیں"

ہم آگے بڑھ گئے۔

اُودبلاؤ

"یہ سرد ملکوں کا جانور ہے، اس سے یہاں کی گرمی سہی نہیں جاتی، اس لئے پہلے پہل اس کے لئے خاص طور سے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی لایا جاتا تھا، لیکن اب وہ بند کر دیا گیا ہے۔ تبھی دیکھئے یہ پانی کے باہر بیٹھ کر ہانپ رہا ہے، شاید ہوا کے جھونکے سے بدن کچھ ٹھنڈا ہو"

میں نے کہا —— "اس کے پیر میں کیا ہوا ہے؟ اس کے پاؤں سے خون بہہ رہا ہے"

رما بولی —— "یہی ہے نا وہ جو حوض میں سے پیسے نکال لاتا ہے؟"

گائیڈ نے کہا —— "ہاں آپ دونوں کے سوالوں کا ایک ہی جواب ہے، یہ

ابھی بتاتا ہوں۔ ٹھہریئے، پیسہ مت ڈالیئے۔"

دماڑک گئی، گائیڈ کہنے لگا ——— "جب سے یہاں آیا ہے تبھی سے پیسہ نکالنے والا کھیل شروع ——— ہے۔ اُود بلاؤ تو پانی کا جانور ہے مچھلی، مینڈک کھاتا ہے لیکن یہاں اُسے چھیچھڑے دیئے جاتے ہیں اور اُنہیں کے پیچھے وہ پانی میں بھاگتا ہے۔ لوگ پیسے پھینکتے تو خوراک سمجھ کر وہ اُن پر بھی جھپٹتا ہے مگر مایوس ہوکر اُنہیں کنارے پر لا رکھتا ہے، اور لوگ اپنے پیسے اُٹھا لیتے ہیں۔ اِسی طرح وہ سدھ بھی گیا۔ پچھلے سال گرمیوں میں کچھ لوگ دیکھنے آتے۔ تب بھی وہ ایسے ہی گرمی سے گھبرایا ہوا پڑا تھا جیسا اب ہے ——— تب ٹھنڈے پانی کا انتظام نیا نیا بند ہوا تھا۔ دیکھنے والوں میں سے ایک لڑکے نے چونی پھینکی، وہ کانپتی ہوئی ڈوب گئی۔ اُود بلاؤ نے اُدھر دیکھا نہیں۔ نہ اپنی جگہ سے ہلا۔ لڑکا رونے لگا۔ باپ نے پوچھا، کیا ہے؟ چونی کی بات سن کر اُسے بھی فکر ہوا اور وہ اپنی چھڑی سے اود بلاؤ کو اٹھانے لگا۔ تھوڑی دیر تو اود بلاؤ نے اس کی پرواہ نہ کی، لیکن جب اُس نے دیکھا کہ بے پروائی سے چھٹکارا نہیں ملتا تو خفا ہوکر پھنکارنے اور دانت نکالنے لگا۔ لڑکے کے پتا تو حیران ہو رہے تھے مگر لڑکے کے چچا بھی ساتھ تھے۔ وہ بمبئی کے ایک مل کے مینیجر تھے اور کام نکالنا جانتے تھے۔ بولے میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں لاتا۔ اُنہوں نے جیب سے چاقو نکال کر چھڑی کے آگے باندھا اور اُود بلاؤ کے چبھانے لگے۔ اُود بلاؤ جھپٹا تو چاقو اُس کے پیر میں لگا۔ اُس نے غصّے سے اندھا ہوکر پھر وار کیا۔ تب ایک آنکھ میں بھی چاقو لگا۔ اب اُس نے ہار کر ڈبکی لگائی اور چونی لا کر رکھی۔ تبھی سے پیر کا زخم اچھا نہیں ہوتا جب کبھی وہ پانی میں جاتا ہے تو خون کی ایک لکیر کھنچ جاتی ہے۔ اور آنکھ کا زخم تو گندا ہو گیا تھا۔ اُس سے آنکھ ہی ضائع ہو گئی۔ آپ جانتے ہیں گرم ممالک میں زخم کتنی جلدی خراب ہوتا ہے۔"

میں نے کہا ——— "آنکھ گئی بچارے کی، کسی نے ———"

"جی ہاں آپ اُسے جگائیں تو نظر آئے گی، ابھی نظر نہیں آتی۔ ہے۔"

رمانے جو اکنی نکالی تھی۔ وہ واپس پرس میں ڈال لی، اور خاموش سی کھڑی رہی۔
گائڈ بولا ——— "نہیں آپ اکنی کی فکر نہ کریں وہ لے آئے گا۔ اجڈ سے اجڈ آدمی بھی سبق سیکھ کر سیدھا ہو جاتا ہے۔ یہ تو بچارا بےبس جانور ہے" یہی وہ مل مینیجر کہتے تھے میں جانتا تھا کہ رما نے اکنی کیوں واپس رکھ لی، لیکن گائڈ کے غلط سمجھنے سے مجھے غصہ نہیں آیا، رما مجھے چڑیا گھر گھسیٹ کر لائی ہے اچھے مزا! اب کبھی آنے کا نام نہ لیگی!

باگھ کے بچے

ہم نے وارڈ کی طرف دیکھ کر پڑھا ——— "فرزند کی پیدائش کی خوشی میں نواب ——— کی جانب سے دان"
رما نے کہا ——— "کیسے خوبصورت بچے ہیں کھیلنے کو جی چاہتا ہے"
گائڈ نے کہا ——— "بچے کس طرح اتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہی تعجب کی بات ہے شاید تکلیف سے جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ خوبصورت ہی ہوتی ہے۔ نہیں تو" یکایک میری طرف دیکھ کر وہ رک گیا، پھر بولا ——— "اچھا لیجئے نہیں کہتا معلوم ہوتا ہے آپ فلسفہ کے پروفیسر ہیں، اسی لئے فلسفے سے چڑتے ہیں۔ خیر میں اپنا کام کروں، کہانی ہی کہوں؛ سنئے جس رات نواب زادے کا جنم ہوا، اُس رات نواب صاحب نے بڑا بھاری جشن کیا۔ شراب میں مست ہو کر جب وہ بیٹھنے کے ناقابل ہو گئے۔ تو اندر محلوں کی طرف چلے خوابگاہ کے باہر ایک کنیز کھڑی تھی اُس سے اُنھوں نے کچھ بھدا مذاق کیا۔ وہ بولی کچھ نہیں، بولنا ضروری بھی نہ تھا، لیکن اُس نے وہ مسکراہٹ بھی ادا نہ کی جس کے پانے کا حق نواب صاحب کے مذاق کو تھا۔ نواب صاحب بگڑ گئے۔ اور کنیز کو اندر کھینچ لے گئے، وہاں اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے، اُس نے بہت معذرت کی، التجا کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ حاملہ تھی، آخر میں اُس نے اپنے پیدا ہونے والے بچے کے نام پر نواب صاحب سے رحم کی بھیک مانگی، لیکن نواب صاحب آپے میں نہیں تھے۔ اُنھوں

نے اُس کے پیٹ پہ لات ماردی۔ کنیز لڑکھڑا کر بیٹھ گئی۔ تکلیف اور ایک ناقابلِ برداشت خوف سے اُس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ تب اُس نے پھنکار کر کہا ـــــ "نواب صاحب یاد رکھنا ماں شیرنی ہوتی ہے!" نواب صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا ـــــ "نواب کیا شیرنی سے ڈرتا ہے؟ لیکن کنیز کو باہر نکلوا دیا۔ اگلے دن جب کنیز معافی نہ مانگنے پر جیل بھیجی گئی تو نواب صاحب کو سوجھا کہ حاملہ شیرنی کا شکار کرنا چاہیئے۔ شکار کا انتظام ہوا اور ایک شیرنی ماری گئی۔ گولی لگنے پر جب وہ چھٹپٹانے لگی تو تین بچے پیدا ہوئے۔ بے وقت پیدا ہونے سے دیکھئے اِن کی کھال کیسی ملائم اور خوبصورت ہے! ابھی میں کہتا ہوں "تکلیف خوبصورتی کی ماں ہے۔"

رما نے ٹوک کر کہا ـــــ "اور باندی کا کیا ہوا، اُس کا بچہ؟"

گائڈ ہنس دیا، بولا ـــــ "مجھے معلوم نہیں۔ معلوم ہو بھی کیوں؟ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا نا، میں اِس چڑیا گھر کی آتما ہوں دُنیا کی آتما نہیں ہوں میری کہانی اِسی کی کہانی ہے۔ لیکن دُنیا بھی ایک چڑیا گھر ہے تو اُس کی کہانی کے لئے آپ ـــــ"

لیکن میری قوتِ برداشت ختم ہو چکی تھی۔ میں رما کو کھینچتا ہوا ایک طرف کو نکل چلا۔ مجھے باہر کا راستہ معلوم نہیں تھا اِس لئے ایک طرف کو پھاٹک دیکھ کر اُدھر ہی لپکا۔

چڑیا گھر کا صاحب

پھاٹک کے پاس میں ٹھٹھک گیا، اُس پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا تھا ـــــ

خبردار! بغیر تحریری اجازت کے اندر مت جاؤ۔!

میں کہنے کو تھا کہ اب کیا کریں؟ کہ میں نے دیکھا۔ گائڈ پاس کھڑا مسکرا رہا ہے

میں نے غصہ دباتے ہوئے کہا ـــــ "یہاں کونسا جانور رہتا ہے؟"

"یہ چڑیا گھر کے صاحب کا بنگلہ ہے۔"

"ایں؟"

"ان کی بھی کہانی کہہ دوں؟" کہہ کر بغیر جواب کا انتظار کیئے چڑیا گھر کی آتما بولی۔
"صاحب ہمارے راجہ کے چچازاد بھائی کی اولاد ہیں ——— ایک طوائف سے۔ یہ کہانی
بہت کم لوگ جانتے ہیں، کیونکہ یہ طوائف بہت دیر تک کنور صاحب کی چہیتی رہی، اور
وہ اس کے لڑکے کو شہزادے کی طرح پالتے رہے، اُسے بھی اپنی ماں کا پتہ نہیں لگا۔ ایکبار
شہزادے کی کالج میں کسی دوسرے شہزادے سے لڑائی ہوگئی اور اُس نے اسے طوائف
زادہ کہہ دیا۔ جب پوچھنے پر سچائی کا پتہ لگا تو وہ دُکھ سے پاگل ہوگیا۔ جب پاگل پن کچھ
ٹھیک ہوا تو اُس نے کالج جانے سے انکار کیا اور یہیں رہنے لگا۔ اب بھی اُس کا پاگل
پن مٹا نہیں، لیکن اب یہ حالت ہوئی کہ جب کوئی اُس کا نام لیکر یا کنور صاحب کہکر بلاتا
تو اُسے دورہ پڑ جاتا اور وہ قتل کرنے کو تیار ہو جاتا! اجنبی بھی اگر اُس کا نام پوچھ بیٹھے، یا
کوئی اور ایسی بات کرے جس سے اُس کا دھیان اپنے والدین کی طرف جائے تب بھی
یہی حالت ہوتی۔ ورنہ وہ بالکل ٹھیک رہتا۔ جانوروں سے اُسے خاص دلچسپی تھی، اس
لیئے راجہ صاحب نے اُسے یہاں مقرر کرکے اس بنگلے میں رکھ دیا اور باہر یہ بورڈ لکھوا
دیا۔ کہ کوئی بھول کر بھی ادھر نہ چلا جائے۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر خود ہی بولا ——— "معلوم ہوتا ہے آپ اندر نہیں
دیکھنا چاہتے" میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ رما کی طرف دیکھ کر بولا ——— "میں
نے پہلے ہی کہا تھا، آپ کو دوبارہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی"
اور میں نے پھر دیکھا، اُس کی مسکراہٹ میں ایک تیز طنز تھی۔ میں نے رما سے کہا۔

"دیکھ لیا، اب چلو باہر" ———
ہم چلے، رما کچھ بولی نہیں، میں نے طنز سے پوچھا ——— "کیسی رہی سیر چڑیا گھر کی؟"
اس نے میرا غصہ سمجھ کر گویا آگ میں گھی چھوڑتے ہوئے کہا ——— "عجیب تھی ———"
"عجیب کہتی ہو تم ——— عجیب؟ ایسا شرا گندا، مکروہ، ڈسگسٹنگ دن میں نے
کبھی نہیں گزارا، اب کبھی چڑیا گھر آؤں تو میرا نام ———"

"کیسے نہیں آؤ گے تم چڑیا گھر میں؟"

اپنے بالکل پاس غصّے سے جلتی ہوئی یہ گرج سُن کر میں سہم گیا۔ چڑیا گھر کی آتما، وہ گائیڈ میرے بالکل قریب کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی، جسم غصّے سے کانپ رہا تھا ——— "کیسے نہیں آؤ گے تم چڑیا گھر میں؟ جاؤ گے کہاں تم؟ وہاں باہر؟ ——— ایک بہت بڑا چڑیا گھر ہے۔ جس میں تم بند ہو، تم!"

وہ یکایک اتنا قریب آ گیا کہ اُس کی سانس مجھ پر پڑنے لگی اور لمبی داڑھی کے بال مجھے چبھ گئے۔ میں نے یکایک گھبرا کر رما کو کھینچتے ہوئے کہا ——— رما، چلو باہر چلیں . . . "

میں کانپتا ہوا جاگا تو دیکھا کہ میرا چھ برس کا مُنّا اپنی ننھی ننھی میرے کندھے پر رگڑ کر مجھے جگانا چاہتا ہے، اور اُدھر رما وہی پیلی ساری پہنے پیار بھرے لہجے میں کہہ رہی ہے ——— "پوستی جی چلنا نہیں باہر؟" میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا بولا ——— "چلو، مگر کہاں؟"

اُس نے اور بھی دلکش تبسّم اپنے چہرے پر جال کی طرح بکھیرتے ہوئے کہا ——— "کیوں، چڑیا گھر نہیں چلو گے؟"

میں ڈوبتے ہوئے سُروں میں کسی طرح کہہ سکا، "چلو . . . "

علی عباس حسینی

جھبّو کا ہیرو

جھبّو خاں نے اپنے پلنگ سے آواز دی: "کیوں بھیّا آج حقّہ نہیں پیو گے؟"

جھبّو ابا جان کے پیادے کا نام تھا۔ وہ ہمارے مکان کے مردانے حصّے میں پُورب والے دالان میں سب سے الگ لیٹتا تھا۔ جھبّو کا گاؤں میں گھر تھا اور گھر والی بھی موجود تھی لیکن وہ رات کو سوتا ہمارے ہی ہاں تھا۔ پورب کا دالان اور اُس کے ساتھ کوٹھڑی اُس کے لیے مخصوص تھی۔ کوٹھڑی میں جہاں ہمارے ہاں کا لکڑی کا غیر ضروری سامان رکھا تھا وہیں جھبو کے دو ایک گھڑے بھی چپنی سے ڈھکے ہوئے رکھے رہتے تھے۔ اسی کوٹھڑی میں کسی طاق پر تھوڑی سی تمباکو اور دو ایک چھوٹے بڑے توے بھی صبح سویرے کی "دو کشتی" کے لیے موجود رہتے تھے۔ ان گھڑوں میں کیا تھا۔ اس کی ہمیں خبر نہیں۔ اس لیے کوٹھری میں ہر وقت قفل پڑا رہتا تھا۔ اور وہ صرف دو مرتبہ دن رات میں کھلتی تھی۔ ایک بار تو زیل نکالنے کے لیے اور دوسری بار زیل سونت کر رکھ دینے کے لیے۔

یہ زمانہ ہم لوگوں کی طالب علمی کا تھا اور ہم مردانے مکان کے دوسرے دالان میں رہتے تھے ہمیں بن بیاہا ہونے کی وجہ سے ابھی حقہ یا سگرٹ سب کے سامنے پینے کی اجازت نہ ملی تھی۔ اس لئے یہ کام چوری چھپے ہی ہوا کرتا تھا، اور ہم کو اس کے لئے جھبو ہی کا ممنون ہونا پڑتا تھا جھبو بھی اس شے کے استعمال میں مدد دینا اپنا فرض سمجھتے تھے، اس لئے کہ ان کے نزدیک حقہ اور پان ہندوستانی تہذیب کا جزوِ اعظم تھے۔ وہ کہتے تھے "میاں وہ بھی کوئی آدمی ہے جو نہ حقہ پیئے اور نہ پان کھائے! بھلا اس کے ہاں کوئی جائے گا کاہیکو؟ ہر وقت جان پڑے گا۔ رمضان شریف پر اجمان ہیں! پھر میاں یہ رئیسوں کی شان ہے تختوں کا چوکا لگا ہے مسند ہے گاؤ ہے لوگ جوق جوق چلے آرہے ہیں حقے پر حقہ ملازم بھر کر دے رہا ہے خاصدان پر خاصدان گلوریوں سے بھرا چلا آرہا ہے دوست احباب عزیز اقارب حقہ پیتے ہیں، پان کھاتے ہیں، دو گھڑی بیٹھ کر جی بہلاتے ہیں، یہ چیزیں نہ ہوں تو کتے نہ لوٹیں! پھر کوئی تھوکنے بھی نہ آئے!"

غرض جھبو نے ہمیں حقہ پینے کا عادی کر دیا تھا، اور گو تمباکو کے سارے پیسے ہماری ہی جیب سے جاتے تھے لیکن مزا بھی بڑا آتا تھا۔ نریل کا دور ہوتا، ہر شخص صرف دو کش لگا سکتا تھا اور جب پورا حلقہ ختم ہو جاتا تو اس کی پھر باری آتی تھی۔ اسی لئے اس طریقے کو دو کشی کہتے تھے ہم لوگ یعنی جھبو کے آقا و مالک کے صاحبزادگان و اعزا، تو اس کے ساتھ ہی پلنگ پر جگہ پاتے اور دوسرے یعنی جھبو کی طرح کے اور ملازمین نیچے زمین پر اکڑوں بیٹھتے لیکن دو کشی میں شریک سب ہوتے تھے بس ایک شرط تھی۔ وہ یہ کہ اس دوران میں سوائے جھبو کے کسی کو بولنے کا حق نہ تھا۔ یہ جھبو کا دربار تھا، یہاں کسی اور کو زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ نریل کے سوندھے سوندھے دھوئیں کے ساتھ جھبو کی باتوں میں بڑا مزا آتا تھا۔ وہ واقعی جہاندیدہ اور تجربہ کار تھا۔ اس نے عراق عرب، ایران و طہران سب دیکھ ڈالا تھا جنسی معاملات میں اس کی کدوکاوش ڈان جوان، کسانوا اور کوکا پنڈت کی یاد دلاتی تھی، بقول اسی کے اسے ہر مذہب ہر ملک، اور ہر قوم کی عورت کا تجربہ تھا۔ اور وہ ان

جھوٹے سچے واقعات کو کچھ اس طرح چٹخارے لے لے کر بیان کرتا کہ ہم ناکردہ کار شرما شرما کر گردنیں نیچی کر لیتے اور اکثر یہ کہہ کر جھڑک دیتے "جھبّو خاں اب تم واقعی بوڑھے ہو گئے اور بہت بکنے لگے!"

جھبّو اس جھڑکی پر شرمسار نہ ہوتا بلکہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا "بھیّا! یہ تو سن ہی ایسا ہی کا ہے۔ چھٹپنے میں ٹانگوں میں قوت ہوتی ہے، بچہ ہر وقت دوڑتا پھرتا ہے، جوانی میں کمر میں بوتا ہوتا ہے، جوان ہر کھیت میں بیج بوتا پھرتا ہے، بڑھاپے میں تو کام کی بس ایک بی للو ہی رہ جاتی ہیں، وہی چلتی رہتی ہیں! ہائے اب جوانی نہیں رہی، تو باتیں بھی نہ بناؤں؟"

مگر یہ طربیہ رنگ اس وقت حزنیہ میں بدل جاتا جب ابا جان کی ڈانٹ پڑتی، یوں تو انہوں نے ساری جائداد اور زمینداری جھبّو پر چھوڑ رکھی تھی، جو کچھ اس نے وصول کر کے لا دیا انہوں نے لکھ لیا اور رسید کاٹ دی، نہ کبھی روپیہ مانگتے، نہ تقاضا کرتے، نہ اعتراض، نہ شکایت نہ حکایت! مگر مالگذاری ادا کرنے کے زمانے میں یہ روش بالکل بدل جاتی، روزانہ جھبّو بلائے جاتے سوال و جواب ہوتے اور دن میں کئی کئی بار پھٹکارے جاتے۔ اس زمانے میں جھبّو کی داستان گوئی نوحہ خوانی سے بدل جاتی۔ بس اس کا ماتم ہوتا کہ "ہائے میاں کیوں نہ سچ مچ کے زمیندار ہوئے! سال بھر تو نماز و تہجد و استغفار میں پڑے رہیں گے، نہ کسی اسامی کو بلوائیں گے، نہ کسی کو ماریں گے، پیٹیں گے، نہ کسی پر بقایا لگان کریں گے، نہ بیدخلی کریں گے نہ فوجداری دائر کریں گے اور نہ دیوانی ——— اور جہاں مالگذاری کا زمانہ آیا اور جھبّو کے سر آفت آ گئی" "تم نے ساری زمینداری کا ستیاناس مار دیا! تم کسانوں سے روپیہ وصول کر کے کھا جاتے ہو تم کو جیسے بھی ہو، اس وقت روپیہ لانا ہی پڑے گا! جیسے میں نے گھر میں قارون کا خزانہ گاڑ رکھا ہے۔ بس یہاں کا حکم ہوا نہیں کہ میں نے فوراً روپے لا کر ڈھیر کر دیئے! پوچھو، میاں، چار روپے کے ملازم کی اوقات ہی کیا۔ ایسا ہی روپیہ والا ہوتا تو چاکری ہی کیوں کرتا!

اس دن صبح کو جھبّو نے ہم لوگوں کو حقہ میں شرکت کی دعوت اسی لئے دی تھی کہ وہ

رات سو ڈانٹا گیا تھا۔ اور اُسے اپنی نوحہ خوانی کے لئے سامعین کی ضرورت تھی۔ اس کے دل میں یہ سُبکی کھٹک رہی تھی کہ رات ابا جان نے اس سے ہمارے اتالیق کی حیثیت چھین کر اس کی اصلی پوزیشن، جو محض ایک پیادہ کی تھی۔ اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ اس وقت وہ ابّا جان پر غصّہ اتار کر اپنی کھوئی حیثیت ہماری نظروں میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس لئے ہم جب اس کے پلنگ پر بیٹھ چکے تو اُس نے ہماری طرف نریل بڑھا کر کہا "آج حقہ میں کوئی مزا نہیں آ رہا ہے"

میں نے پوچھا "کیوں! کیا تمبا کو دوسری ہے؟"

جھبو بولا "نہیں بھیّا، حقہ ہو یا کھانا، اچھا اسی وقت لگتا ہے جب آدمی کا دل خوش ہو"

میں فوراً سمجھ گیا کہ خان صاحب کا یہ فقرہ اظہارِ ہمدردی کے لئے ایک سُشت ہے۔ میں نے کہا "ارے میاں جھبّو تم بھی کہاں ابا جان کی خفگی کا خیال کرتے ہو، نیک آدمیوں کو جب غصہ آتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو ہی جاتے ہیں"

جھبّو کو بس وہ موقعہ مل گیا جس کی انہیں تلاش تھی۔ دل میں چھپے ہوئے بخارات کو باہر نکلنے کے لئے راستہ مل گیا۔ وہ بولا "کیا کہوں بھیّا کہ میاں کی کیا حالت ہے۔ ہر وقت نماز روزے میں لگے رہیں گے، نہ کاغذ دیکھیں گے نہ پتر! نہ سال بھر اُس کی فکر کریں گے کہ جھبو کیسی محنت اور کوشش کر کے ان نادہندا اسامیوں سے روپے وصول کر کے لاتا ہے۔ ہاں بس جاگیں گے تو مالگزاری دینے کے وقت۔ اور اسامیوں کی نادہندگی کا سارا غصّہ اتاریں گے جھبّو پہ! سچ ہے "جبرا[1] مارے اور رونے بھی نہ دے!" میں نے تسکین دینے والے لہجے میں کہا "تو یہ آفتیں تو تم پچیس برس سے جھیلتے آ رہے ہو، نئی کونسی بات ہے؟"

جھبّو نے کہا "نئی تو نہیں بھیّا، پر کبھی کبھی یہ دل ضرور چاہتا ہے کہ ہمارے میاں

[1] زبردست

بھی اور زمینداروں کی طرح ہوتے! انہیں بھی زمینداری کرنی آتی!"

حمید نے یہ سمجھ کر کہ اب جھبو سے کوئی نہ کوئی قصّہ سننے کا اچھا موقع ہے اسے تاننے کے کہا: "واہ خاں صاحب واہ! جیسے بھائی جان کو زمینداری نہیں آتی تم تو زمیندار کے معنی نہ جانے کیا سمجھتے ہو!"

جھبو خاں کے بارود میں آگ لگ گئی۔ بھڑک اٹھے: "حمید میاں، ابھی آپ نے زمیندار دیکھے کہاں ہیں؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش! آپ کو زمیندار دیکھنا ہو تو دیکھئے ٹھاکر چھیدی سنگھ کو وہ ہیں زمیندار!"

حمید نے اور چھیڑا: "کون وہی راج پور والا، باجی! ڈاکو!"

جھبو نے اپنے حقے کے دو کش بھی نہ لگائے۔ نریل میری طرف بڑھا دیا۔ وہ گرما کر بولا۔

"واہ میاں واہ! کیا بات کہی آپ نے! چھیدی سنگھ اور ڈاکو! جیسے وہ کسی کے گھر جا کر ڈاکہ ڈالتے ہیں یا کسی دوسرے کا مال زبردستی چھین لیتے ہیں! ارے میاں اپنی زمینداری ہے، باپ دادا کی پیدا کی ہوئی، تلوار کے زور سے، انگنی جنگنی کی نہیں ہے! اپنی چیز ہے اس پر رعایا یہ جب لگان نہیں دیتے، اکڑتے برتتے ہیں تو ان کو زمیندار کی طرح سزا دیتے ہیں! آپ کیا جانیں کہ سیدھی انگلی کبھی گھی نہیں نکلتا۔ چمار ہیں تو جب تک ان کی چمڑی نہ ادھیڑے بیگار نہ دینگے کوری ہیں تو جب تک اُن سے لٹھم لٹھا نہ کیجئے کوڑی نہ ملے گی۔ اور اہیر تو اسے باجی ہیں کہ بڑکھوں کے سمے سے کہاوت چلی آتی ہے: اہیر بھیڑ نہ بکرا۔ بہوت بہاؤں کھائیں چار لکھٹا!۔۔۔"

میں نے کہا: "ان بیچاروں کے بارے میں یہ کہاوتیں بھی زمینداروں ہی کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں!"

جھبو اس طرح مڑ پڑا جیسے میں نے پہلو میں اچانک سوئی چبھا دی ہو ـــــ بولا: "بھیا آپ تو ایسی بات نہ کہئے! آپ کی سات پشت سے زمینداری چلی آ رہی ہے۔ اور آپ کو بھی ایک دن زمیندار ہونا ہے۔

لہ صبح ہوتے ہی چار ڈنڈے کھائیں

میں نے کہا "نوخاں صاحب میں تو اپنے باپ ہی کا بیٹا ہوں، زمینداری تم ہی کروگے یا تمہارا بیٹا!"

جھبو کی آنکھیں چمک اٹھیں، آئندہ ہونے والے مالک کی طرف سے اپنے ہی لئے سہارا نہ ملا بلکہ اپنے لڑکے کی پرورش کی بھی امید ہو گئی۔ بولا "اسی لئے تو بھیا کہتا ہوں کہ میاں کی طرح زمینداری نہ کیجیئے گا، چھیدی سنگھ کی طرح کیجیئے گا!"

حمید نے آزردہ آواز بنا کر کہا "تو کیا کرتے ہیں چھیدی سنگھ سورما؟ ذرا ہم بھی تو سنیں"

جھبو نے نریل کے کئی کش آہستہ آہستہ حلق سے اتارے۔ گویا وہ ایک کہانی کہنے والے کی طرح اس پر غور کر رہا تھا کہ قصہ کی ابتدا کیونکر کی جائے اور اسے کیونکر زیادہ سے زیادہ پُر اثر بنایا جائے۔ اس نے آہستہ آہستہ ذرا رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔

"میں آپ لوگوں کو ٹھاکر چھیدی سنگھ کا ایک قصہ سناؤں۔ اُن کے گاؤں میں ایک بڑا ہی پاجی اور سرکش کسان تھا، سکھوا۔ یہ ذات کا اہیر تھا۔ نیا نیا جوان ہوا تھا، ہاتھ پاؤں اچھے نکالے تھے، کشتی بھی لڑتا تھا۔ اس لئے اُسے اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ ہر بات پر لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا، ہر ایک سے لڑتا اور موقع بے موقع خم ٹھوک کر سامنے آ جاتا۔ ٹھاکر صاحب کا بھی لگان اُس نے نہ دیا۔ جب گماشتہ گیا تو اُس نے ٹکا سا جواب دیدیا۔ کہا "جاؤ جی جاؤ، جب روپیہ ہوگا تو ہم ڈاک خانہ جاکر لگا آئیں گے۔"

ٹھاکر صاحب سے جب گماشتے نے جاکر بیان کیا تو وہ سکھوا کی یہ بدتمیزی سن کر آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا "اس بدمعاش کو پکڑ کیوں نہیں لائے؟" اُس نے کہا "حضور فوجداری ہو جاتی، ممکن تھا" اہیر لڑ جاتا۔ پھر اس کے ساتھ ہو جاتی۔ ہم نے کہا سرکار کو خبر کر لیں پھر جیسا حکم ہوگا ویسا کیا جائیگا۔" جھبو نے رک کر اپنے حقّے کے دو کش ذرا لمبے لگائے۔ ہم لوگوں میں ذرا بے چینی بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ بولا۔

ٹھاکر صاحب تھوڑی دیر چپکے سوچتے رہے۔ انہوں نے پھر پوچھا "اَسّم کہ ہمارے پرانے[1]

[1] دشمنی

نہیں ہے؟"

معلوم ہوا اسی کے چچیرے بھائی مگھوا کی اُس سے آج کل خوب چلی ہوئی ہے۔ وہ یہ سُنکر ذرا مسکرائے اور اُنہوں نے اسی دن مگھوا کو بلا کے اس سے بہت گھُل مِل کے باتیں کیں۔ دو تین دن بعد ایک رات کو مگھوا آیا اور ٹھاکر صاحب کے لئے کارندے اور "لٹھ باز" ملازم لے کر "اہیر ٹولیا" چلا گیا۔ وہاں جب سکھوا اور اُس کی بیوی کھا پی کر سو رہے تو یہ سب کے سب اُس کے گھر کی کچّی دیوار چپکے چپکے پھاند کر اندر گھس گئے۔ وہ اپنی مہریا کے ساتھ لیٹا آرام چین کی نیند سو رہا تھا۔ ان لوگوں نے دونوں کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے اُنہیں چیخنے چلّانے نہ دیا۔ اور دونوں کی مشکیں کس کے ٹھاکر صاحب کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ٹھاکر صاحب نے سکھوا کو کھمبے میں بندھوا دیا، اور پوچھا۔

"لگان اب بھی ملے گا کہ مرمت کی جائے؟"

اُس کی بیوی نے اشارہ سے کہا کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو وہ ابھی روپیہ لا دے گی۔ دو آدمی اُس کے ساتھ کر دیئے گئے اور تھوڑی دیر میں سکھوا کا لگان پائی پائی بیباق ہو گیا!"

حمید نے جھلا کر کہا "میں اگر سکھوا کی جگہ ہوتا تو ٹھاکر صاحب پر رپٹ لکھواتا...."

جھبو بولا "جی، مگر ٹھاکر صاحب نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اُنہوں نے پہلے سے اُس کا بندوبست کر رکھا تھا جب سکھوا کا لگان بیباق ہو گیا تو اُنہوں نے پیادوں سے کہا اسے اسی طرح واپس لے جاؤ۔ دیکھتے رہنا نہ تو کسی کو پکار سکے اور نہ جگا سکے۔ دونوں اسی طرح گھر پہنچائے گئے اور گھر میں پہنچ کر ان کی مشکیں کھولی گئیں اور منہ سے کپڑا نکالا گیا۔ جب پیادے "اہیر ٹولیا سے" نکل آئے اور اُنہوں نے شور کیا اور اپنے ہمسایوں کو جگایا تو مگھوا اپنے پلنگ پر سوتا پایا گیا اور پیادے چھاؤنی میں خرّاٹے لے رہے تھے"

حمید نے کہا "یہ سب سہی، لیکن دیوار پھاندنے اور مکان میں گھسنے کے نشانات تو ملے ہوں گے"

جھبّو نے ایک جیتے ہوئے جواری کی طرح ہنسکے کہا "ہاں ملے تو، مگر گواہی کون دیتا۔ کس کی شامت آئی تھی۔ پھر کسی نے اپنی آنکھوں سے کبھی پیادے ملازم کو آتے جاتے دیکھا تھا؟ سکھوا پھر بھی تھانے گیا۔ تھانیدار آئے۔ چھاؤنی میں جاکر ٹکے۔ ٹھاکر صاحب سے باتیں ہوئیں انہوں نے لکھوا دیا "سب جھوٹ ہے۔ بے دخلی کا دعویٰ ہونے والا ہے اس کی پیش بندی کر رہا ہے۔ اس نے خود گاؤں بھر کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس کا نام چور بدمعاشوں کی فہرست میں ہونا چاہئے۔ اور اس کی برابر نگرانی کی جانے"

حمید نے پھر بات کاٹی۔ وہ غصہ سے بولے "واہ بھئی واہ! کیا انصاف ہے! . . ."

جھبّو نے ان کو بڑے غور سے دیکھا۔ گویا وہ کوئی نئے قسم کے جانور تھے جسے اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"میاں آپ تو بالکل بچّوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ ارے بھیّا زمینداری اور انصاف کا باپ مارے کا بیر ہے! انصاف کرنا ہے، ایمانداری کرنا ہے، تو کہیں مسجد میں جاکر نماز پڑھائیے یا مندر میں بیٹھ کر مالا جپیئے! زمینداری کا ہیکو کیجیئے!"

میں نے دونوں کے بدلتے ہوئے رنگ سے یہ خطرہ محسوس کرکے کہ اب دونوں میں واقعی جھڑپ ہونے والی ہے، جلدی سے جھبّو کو کہانی کے سلسلے کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے کہا "ارے خاں صاحب ان کی باتوں پر نہ جاؤ، یہ تو بے سمجھے بوجھے یونہی ٹوک دیا کرتے ہیں تم یہ بتاؤ کہ سکھوا نے کیا کیا۔

وہ بولا "صاحب سکھوا بڑا گھمنڈی تھا، جوان تھا نا؟ اور اہیر بھی! بس اُلٹ ہو گیا۔ لگا ٹھاکر صاحب کو گالیاں دینے اور اُن سے بدلہ لینے کی تدبیریں سوچنے۔ پر وہ اُن کا کر ہی کیا سکتا تھا۔ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ دس بارہ نوکر چاکر، کما شتے پیادے ہر وقت ان کے ارد گرد موجود رہتے تھے۔ اس لئے ان کا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ پر ایک رات کو جب ٹھائیں ٹھائیں پانی پڑ رہا تھا اور منگھوا اپنے کھیت میں پانی روکنے کے لئے مینڈھیں باندھ رہا تھا سکھوا لاٹھی لیکر اس پر پل پڑا۔ منگھوا بھاگ نہ سکا اس لئے اس نے شور کیا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑے پر

جب تک وہ آئیں آئیں سکھوا نے مگھوا کو مار کر گرا دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگ مگھو راسی لاد کے ٹھاکر صاحب کے پاس لائے۔ اُنہوں نے اُسی وقت ڈولی کہار کا انتظام کر اسے اسپتال بھجوا دیا اور اُس کی طرف سے رپٹ لکھوا دی۔

دارو غہ جی دوسرے ہی دن آئے اور سکھوا کو پکڑ کے لے گئے۔ پہلے تھانے ہی میں خوب مرمت کی گئی۔ پھر مقدمہ قائم ہوا۔ نہ مچلکہ ہوا نہ ضمانت ہوئی اور نہ کوئی صفائی میں عدالت کے سامنے گیا۔ بس دو برس کی سزا ٹھک گئی! . . . . "

حمید نے پھر بات کاٹی۔ وہ بولے "ہو جانے دو سزا! اس نے بھی تو اس دغا باز مگھوا کو درست کر دیا۔!"

جھبو مسکرایا۔ بالکل اس طرح مسکرایا جس طرح "بہیلیا" شکار کے پروں میں گوند لگا کر مسکراتا ہے۔

اس نے کہا "حمید میاں، آپ نے پھر وہی بے سمجھے بوجھے بات کہہ دی، ارے یہ تو سوچیے کہ اس میں ٹھاکر صاحب کا کیا نقصان ہوا؟ لڑے آپس میں سکھوا مگھوا۔ ہاتھ ٹوٹا مگھوا کا۔ جیل جھیلا سکھوا نے! ٹھاکر صاحب تو ویسے کے ویسے ہی بنے رہے، بھیا زمینداری اسی کو کہتے ہیں۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے! میاں یہ راج و دیا! اسے آپ لوگ ابھی کیا سمجھیں!"

حمید کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہ تھا، اُنہوں نے ایک لمبے کش کے دھوئیں میں اپنا منہ چھپا لینا ہی مناسب سمجھا! ❊

اُنہوں نے مجھے زندگی کے مصائب اور رنج و الم کے راز بتائے ہیں . . . اور اسی طرح میں گھنٹوں غور میں کھویا ہوا بیٹھا رہا ہوں۔

علی الصبح سورج رقص کرتا ہوا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ اُس کی روشنی فرش پر بکھر جاتی ہے، دیواروں پر رقص کرتی ہے اور تصویروں سے اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور کمرہ کے سیاہ اور زرد رنگ کے پردے بھی نئے سورج کی خوشی کے ساتھ ساتھ وجد میں آجاتے ہیں۔ باہر سڑک پر آدمیوں اور گاڑیوں کا ایک اَن تھک تانتا بندھا رہتا ہے سودے والے طرح طرح کی آوازیں لگاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ اور اُن کے شور سے کمرہ گونج اُٹھتا ہے۔

اتوار کے دن قریب کے گرجا گھر سے گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور اُن کی جھنکار میں ہنسی ہوتی ہے، خوشی کا ایک نغمہ۔ پھر جوق کے جوق لاغر بوڑھے عیسائی اور پھر کیلیے لباس پہنے ہوئے عیسائی عورتیں سامنے سے گذرتی ہیں۔ پھر گانے کی آواز آتی ہے اور اُردو کے بھجن جو انگریزی راگوں میں گائے جاتے ہیں۔ اپنے شور سے فضا کو بھر دیتے ہیں۔

شام کو سورج دبے پاؤں آتا ہے اور روشندان سے جھانکتا ہے اور اُس کی روشنی ایک سرخ اور سیاہ رنگ کی تصویر پر پڑتی ہے۔ یہ تصویر ٹیڑھی ہو گئی ہے لیکن سستی اور کوفت کی وجہ سے میں نے اُس کو ٹھیک تک نہیں کیا۔ میرے بہت سے ملنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اُس کو جان بوجھ کر اسی طرح فریم کروایا ہے۔ کیونکہ میرے کمرہ میں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اُن کے خیال میں میں نے لوگوں کا مضحکہ اُڑانے کے لئے رکھ چھوڑی ہیں۔ مثلاً ایک آسٹریا کا بنا ہوا پائپ اور ایک عجیب سا سیاہ پردہ۔ جس پر آدمیوں بچوں۔ بجریوں، ہاتھیوں اور گھوڑوں کی مختلف رنگوں کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں جس کے ایک سرخ گھوڑے کی پشت پر "علی صاحب کا" لکھا ہوا ہے

اُس کے معنی اُن کی کچھ سمجھ میں نہیں آتے اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے وہ پردہ نہ صرف اُن کا مذاق اڑانے کے لیئے لگایا ہے بلکہ وہ اُس کو ہندوستان کی زندگی اور آرٹ کی تذلیل تصوّر کرتے ہیں لیکن مجھ کو اُن کے بیوقوف بننے سے لطف آتا ہے۔ اور میں نے اِس پردہ کا راز کبھی افشا نہیں کیا۔ کیونکہ اگر میں نے اِس راز کو کھول دیا تو وہ غائبانہ مسرت جو مجھے ان کی حیرت اور پریشانی سے حاصل ہوتی ہے دور ہو جائے گی اور میری دولت مجھ سے چھن جائے گی۔

ہر روز صبح کو موچی کی تکلیف دہ آواز گلی سے آتی ہے اور سامنے سڑک پر کھو جاتی ہے۔ اُس کی آواز میں دنیا سے بیزاری کا احساس ہے اور اس کی کوفت دہ یکسانی دلخراش معلوم ہوتی ہے۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ اسکی کمر جھک گئی ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ وہ بہت بے جان طریقہ سے تھکی ہوئی آواز سے چلّاتا ہے "موچی کام بوٹ مرمت" اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ جب کبھی میری نگاہ اُس پر اتفاقاً پڑ گئی ہے تو میں نے اُس کو زمین پر اِس طرح سوئی ہوئی آنکھوں سے گھورتے دیکھا ہے۔ جیسے وہ نہ کسی چیز کو دیکھ رہا ہو اور نہ کچھ سوچ ہی رہا ہو۔ اس کی مونچھیں گھنی اور تل چاولی ہیں۔ اس کی آنکھیں چیپڑوں سے بھری ہوتی ہیں اور اُس کے پھٹے ہوئے کپڑے ہمیشہ میلے چیکٹ رہتے ہیں۔ اُس کی کمر پر ایک تھیلا لٹکا ہوتا ہے جس میں بیسیوں پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں حفاظت سے تہ کیا ہوا ایک چمڑے کا ٹکڑا رہتا ہے لیکن اُس کا ایک کنارہ کٹا ہوا ہے۔ جو کسی ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرح آنکھوں میں گڑتا ہے۔ اُس موچی کو دیکھ کر بیہودگی اور غلاظت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسی سرد مہری کا جو بہت ٹھوکریں کھانے اور مصیبت اٹھانے کے بعد پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے زندگی میں حرارت اور دلچسپی باقی نہیں رہتی اور انسان ایک پھٹے پرانے چیتھڑے کی طرح مردہ اور بے جان رہ جاتا ہے جب وہ چلتا

ہے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک زندہ آدمی چل رہا ہے، بلکہ یہی احساس ہوتا ہے کہ جیسے قبر میں سے جیسے رات کو بجّوؤں اور کتّوں نے کھود ڈالا ہو ایک بھوت نکل آیا ہے۔

اس کی آواز میں نہ صرف بیزاری اور تھکن ہے بلکہ زندگی کی بیکاری اور بے ثباتی کا احساس بھی ہے۔ وہ ہمیشہ میرے دروازے کے سامنے آواز لگاتا ہے حالانکہ اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھ سے ٹکے کا کام بھی نہیں مل سکتا۔ مجھے اُس کی آواز سے اِس قدر اُلجھن ہوتی ہے کہ ایک روز بالکل عاجز آ کے میں نے اُس کو اپنے جوتے مرمت کے لئے دیدیئے مگر اُس نے بجائے سنوارنے کے ان کو اور بھی بگاڑ دیا۔ غصہ سے میں نے پیسے اُس کے منہ پر دے مارے اور چلّایا: "یہ لے بھاگ۔ اور یہاں مت چیخا کر سمجھا؟ بھاگ نہیں تو خیر نہیں!"

لیکن سڑک پر پہنچتے ہی اُس نے مری ہوئی آنکھوں سے زمین کو گھورا اور پہلے سے بھی زیادہ تھکی ہوئی آواز اور بے جان آواز سے چلّایا: "موچی کام بوٹ مرمت" غصہ میں میں نے کواڑوں کو دھڑ سے بند کر دیا۔ . . .

ایک مرتبہ دو چڑیوں نے میرے کمرہ کی کارنس میں گھونسلا بنا لیا۔ وہ روشندان سے گھس آتیں اور چوں چوں کر کے ناک میں دم کر دیتیں، اور میری تنہائی میں خلل انداز ہوتیں۔ ایک آدھ روز تک تو میں اس لئے چپ رہا کہ اگر میں نے ان کو نکال دیا تو بیچاریاں بارش اور آندھی میں مر جائیں گی۔ لیکن میرے صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا اور میں اُن کے شور سے عاجز آ گیا۔ اُنہوں نے نہ صرف میرا سکون برباد کر دیا تھا بلکہ اُن کی بیٹ سے میرا دیوان جو اُن کے گھونسلے کے نیچے ہی بچھا ہوا تھا خراب ہو رہا تھا اور شام کی گھٹتی ہوئی روشنی میں اُن کی چوں چوں کی یکسانی دلخراش معلوم ہوتی تھی۔

آخر کار ایک روز میں نے اُن کو اڑانے کی ٹھان لی اور اخبار اور تکیے اُٹھا اٹھا کر اُن پر پھینکنے شروع کئے۔ شام کو ٹہلنے جانے سے پیشتر میں اُن کو اڑا جاتا تھا، لیکن

جب میں لوٹ کر آتا اور بجلی جلاتا تو وہ کارنس پر سے جھانکتی ہوتیں اور میرا دیوان اُن کی بیٹ، اُلجھے ہوئے تاگوں اور تنکوں سے بھرا ہوتا۔ ایک روز رات کو جو مجھے غصہ آیا تو میں نے کھینچ کر اُن پہ تکیہ دے مارا۔ ڈر کے چڑیاں اڑیں اور پھڑ پھڑانے لگیں لیکن پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر دیواروں سے ٹکرانے کے بعد پھر کارنس میں گھس گئیں مگر میں نے اُن کو نکالنے کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ اور ان کو برابر حیران کرتا رہا۔ ایک چڑیا کارنس سے پھسلی اور دیوار سے ٹکراتی ہوئی کتابوں کی الماری پر گری اور لیمپ کے چھوٹے سے بت پر بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے پکڑ کر باہر اندھیرے میں لے جا کے چھوڑ دیا لیکن دوسری اتنی دیر میں سانس لے چکی تھی اور کارنس پر دبک کے بیٹھ رہی اور تکیوں کی مار سے بھی نہ ڈری۔ میں بھی شل ہو گیا تھا اور بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھ کو یہ بھی خیال آیا کہ فضول میں نے اُس ننھی سی جان کو ستایا اور باہر چھوڑ دیا۔ نہ معلوم اُسے بسیرے کے لیے کوئی جگہ ملی یا نہیں۔

اگلے روز دونوں میں سے ایک بھی چڑیا نہ آئی، مجھے اُن کی حالت پر بہت ترس آیا اور میں نے اپنے تئیں لعنت ملامت کی کہ ناحق اُن بے زبان جانوروں پر ظلم کیا چند دنوں کے بعد ایک چڑیا نمودار ہوئی۔ اور کئی دن تک کارنس پر اپنی جگہ بسیرا لیا کی لیکن دوسری کا کچھ پتہ نہ چلا۔ کچھ دنوں کے بعد دوسری نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ شاید اُس نے کسی اور چڑیا سے جوڑا لگا لیا۔ شاید وہ اُس کمرہ سے اُکتا گئی جس میں اُس کا جوڑا ضائع گیا تھا۔ بہر حال وہ چلی گئیں اور مجھ کو تنہا اور اکیلا چھوڑ گئیں۔

کبھی کبھی مجھ کو اپنے کمرہ سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ زندگی سے بیزاری اور کوفت میرے اوپر ایک بھوت کی طرح سوار ہو جاتی ہے۔ اور اس سے کسی طرح نجات نہیں مل سکتی۔ کمرہ ایک قید خانہ معلوم ہونے لگتا ہے اور میں قیدی۔ باہر ہوا چلتی ہے اور نیم اور سرس کی خوشبو اس کو معطر کر دیتی ہے۔ تارے آسمان پر چاندی کے ذروں کا

طرح چمکتے ہیں اور زمین پر اس طرح حسن بکھیر دیتے ہیں۔ جیسے ایک حسین محبوبہ اپنی آنکھوں کے نشہ سے عاشق کے دل میں جان ڈال دیتی ہے۔ لیکن یہاں کمرہ کے اندر نہ حسن ہے نہ محبت۔ صرف کبھی کبھی پردے اس طرح ہلنے لگتے ہیں۔ جیسے کسی نے ان کو چپکے سے ہلا دیا ہو۔ مگر کمرہ میں دن بھر کی گرمی اور سورج کی تیزی کے بعد گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کے اندر کی ہر چیز بدنما معلوم ہوتی ہے۔ تصویریں اور شمع دان، میزیں، کتابیں اور کرسیاں سب مل کر میرے دماغ میں دیوانہ وار رقص کرنے لگتی ہیں اور دیواروں کا زرد رنگ مردہ اور وحشت ناک معلوم ہوتا ہے۔

ایسے موقعوں پر مجھے اپنے کمرہ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ باہر ایک عطر بیز اور خواب آلود ہوا چلتی ہوتی ہے۔ لوگ ٹھنڈے کپڑے پہنے ہوئے سڑکوں پر خرام مہ روی سے ٹہلتے ہیں۔ یا بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کسی خوشگوار اور پر سکون دنیا کے خوابوں میں منہمک ہیں کبھی کبھی کوئی شخص سڑک پر سیلی آواز میں کسی حسینہ کی مدبھری آنکھوں کی تعریف میں گیت گاتا ہوا نکل جاتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی آواز دور ہوتی جاتی ہے میرے دل میں گداز اور رنج بڑھتے جاتے ہیں۔ مجھے اپنی زندگی کی بیکاری کا خیال آتا ہے، اس بات کا کہ جس راستہ پر میں کشاں کشاں چلا جا رہا ہوں۔ وہ بے منزل و بے مقصود ہے۔ زندگی کی سرد مہری اور بے ثباتی کی وہ کیفیت جس کو میں بھول چکا تھا۔ پھر میرے اوپر طاری ہو جاتی ہے اور میں موت کی تسلی بخش آغوش کو یاد کرنے لگتا ہوں . . . . . .

آج شام کو میں تھوڑی دیر کے لئے کمرہ سے باہر گیا۔ سورج کمرہ کی پشت والے دو منزلہ مکانوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ درختوں پر نئی نئی سبز کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ سورج کی کرنیں ان پر رقص کر رہی تھیں اور کونپلوں کے سبز رنگ میں سرخی کی جھلک پیدا کر دی تھی۔ سامنے سڑک پر ننگے درختوں اور بدنما مکانوں کی پرچھائیں تیل کے دھبوں کی طرح پڑ رہی تھیں میں کھڑا ہو کر ان چیزوں کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک لڑکا میلے

اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے گذرا۔ اس کے کندھے پر غلیل لٹکی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک فاختہ تھی جس کو اس نے غلیل سے زخمی کر کے پکڑ لیا تھا۔ فاختہ ابھی تک زندہ تھی۔ اور لڑکا اس کو ایک ہاتھ سے پیار کرتا جاتا تھا۔ اس کے چہرہ پر بڑی خوشی اور فتحیابی کی کیفیت تھی۔ جب لوگ اس کے برابر سے گذرتے تو وہ پہلے چڑیا کو دیکھتا پھر آدمیوں کی طرف اس امید میں نگاہ اٹھاتا کہ وہ اس کو فخر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور اگر کوئی مڑ کر اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ تو وہ جھک کر فاختہ کو پیار کرتا . . . مجھے اس لڑکے کی خوشی پر رشک آنے لگا۔ اس کی مسکراہٹ اور فتحیابی پر لیکن فوراً ہی میں ایک لاانتہا ہی کوفت کے دریا میں ڈوب گیا۔ اور ہر چیز سے بیزار ہو کر کمرہ کے اندر واپس چلا آیا . . . . . .

لیکن یہ کیفیت تو میری زندگی کا ایک جزو بن گئی ہے۔ اس میں نہ کمی ہوتی ہے اور نہ تبدیلی —— ایسے موقعوں پر مجھے یہ شعر یاد آتا ہے ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

لیکن جب کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی تو ہم اپنی تقدیر کے لکھے پر قناعت کر لیتے ہیں اور کوفت کی وجہ سے زندہ پڑے رہتے ہیں۔ لیکن زندگی ہم کو ایک فاحشہ عورت کی طرح نہ تو قبول ہی کرتی ہے اور نہ ہی گھر سے نکال دیتی ہے۔ اور ہم جوکٹ پتلیوں کے مانند ہیں اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جس طرح اس کا جی چاہے ہم کو نچائے ا ہم ایسی زندگی پر قانع رہتے ہیں جس میں نہ خوشی کی امید ہے اور نہ غم سے نجات . .

میرے کمرہ میں ایک شیطان کی شکل کا شمعدان ہے۔ یہ اس بت کی نقل ہے جو پیرس کی نوتردام کے گرجا پر بنا ہوا ہے میں نے اس کے اندر ایک نارنجی رنگ کی موم بتی لگا دی ہے اور اس کا رنگ شمعدان کے پتھریلے رنگ میں بہت خوشنما

معلوم ہوتا ہے ... شیطان کی زبان باہر نکلی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کا منہ چڑا رہا ہے۔ اور اُس کی آنی جانی چیزوں سے نفرت کا اظہار کر رہا ہے میرے بہت سے دوست اُس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ لیکن اُن کی ہنسی میں اس بات کا احساس اور ڈر چھپا ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی بے سود ہے اور بے کار۔ مگر میرے اور دوست اُس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اُن کے دلوں میں اُس شیطان کی وقعت ہوتی ہے جس نے زندگی کی محبت میں اور ایک شنبہ دنیا کی لطافتوں کے پیچھے جنت کے مزوں کو ٹھکرا دیا۔

ایک روز شام کو میں اپنے دیوان پر لیٹا ہوا تھا۔ اسی وقت بارش ہوئی تھی اور زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جھکڑ چل رہا تھا۔ اور لیمپوں کے نیلے رنگ کے جھالر دار ریشمی شیڈ اپنے سر دھن رہے تھے۔ میں مارلو کا ڈراما ڈاکٹر فاؤسٹس، پڑھتے پڑھتے ان سطروں پر رک گیا تھا!

"کیا یہی ہے وہ صورت جس کے پیچھے ہزاروں جہاز ڈوب گئے
جس کی وجہ سے الیَم کی شاندار میناریں جلا دی گئیں؟
پیاری ہیلین مجھے ایک بوسے سے لازوال کر دے . . . ."

اور میں ایک خواب میں کھو گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور میرے کمرہ میں صرف شفق کی ہلکی ہلکی روشنی روشندان سے آ رہی تھی۔ میں اپنے خواب میں کھویا ہوا ایک بھولی ہوئی محبوبہ سے باتیں کر رہا تھا۔ یکایک مجھے یہ احساس ہوا کہ ایک اور شخص بھی کمرہ میں موجود ہے۔ بغیر مڑے میں نے یہ دیکھنے کو آنکھیں اُٹھائیں کہ کون چپکے سے کمرہ میں آ گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے دوست پ ——— بیچ کی الماری کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ میں پھر بے خبر اپنے خواب میں کھویا رہا۔ اتنے میں میرے دوست ایک کرسی پر آ بیٹھے۔ جب میری نگاہ اُن پر پڑی تو ایسا معلوم ہوا کہ اُن کی شکل کچھ بدلی ہوئی سی ہے۔ میں نے غور سے ٹکٹکی باندھ کر ان کی طرف دیکھا پھر تو میری حیرت کا کچھ ٹھکانا

ی نہ رہا۔ کیونکہ کرسی پر میرے دوست نہیں بلکہ شیطان بیٹھا ہوا تھا۔ ایک عجیب قسم کے
وف سے میں تھرتھر کانپنے لگا۔ اور اُٹھ کر مؤدبانہ بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی زبان سے
ونٹ تر کیے اور بہ مشکل بولا :-

"میں نے ایک عورت کے پیچھے اور دُنیا کے مزوں کی خاطر خدا کی طاقت اور عظمت
ے خلاف بغاوت کی۔ اُس نے مجھ کو طاقت اور اقتدار بخشا تھا۔ اور میں اس کا بہت
معتبر اور دیانت دار نائب تھا۔ ہم دونوں نے مل کر آدم کی تخلیق کا مسئلہ طے کیا۔ ہم دونو
نے اُس کا پتلا بنایا۔ لیکن اُس نے حوا کے راز کو مجھ سے چھپایا۔ لیکن جب یہ بھید کھلا تو
میں غصہ اور رشک سے کانپنے لگا۔ اُس آدم کو جسے میں نے ہی بنایا تھا ایک جوڑا دیا گیا۔
لیکن مجھے یہ سزا ملی کہ میں ایک پھیکی اور بے لطف زندگی بسر کروں۔ مجھے بھی تنہائی ستاتی تھی۔
اور مجھے بھی تسلی اور محبت کی ضرورت تھی۔ لیکن اُس نے میرا اور میری ضرورت کا ذرہ بھر
خیال نہ کیا۔ . . ."

اُس کے چہرہ پر رنج اور ایسے افسوس کی کیفیت جھلک اُٹھی جو ایک شخص اپنے لئے
محسوس کرتا ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔ لیکن پھر اُس کا چہرہ غصّہ اور حسد سے تمتمانے
لگا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، اس کی زبان غصہ سے باہر لٹک پڑی اور وہ چیخ چیخ
کر کہنے لگا۔

"صرف یہی نہیں، پھر اُس نے مجھ کو حکم دیا کہ میں اُس آدم کو سجدہ کروں جسے میں نے
ہی بنایا تھا۔ ہاں، ہاں، وہ یہ چاہتا تھا کہ میں اُس کی قوت اور عظمت کے آگے سر جھکاؤں۔
اُس نے مجھ کو ذلیل کیا اور میرا دل اور دماغ اس بات کے لئے چلّانے لگے کہ میں اُس کی
خودی کے خلاف بغاوت کروں۔ یکایک یہ بات صاف طور پر مجھ پر واضح ہو گئی کہ وہ مجھے
صرف اپنے مفاد کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے اور میرے حسین خوابوں کو پیر کی
خاک کر دیا، اور میں بے انصافی اور ظلم سہنے کی تاب نہ لا سکا۔"

جیسے جیسے اُس عظیم باغی کی آواز بلند ہوتی گئی ویسے ویسے اُس کا چہرہ ایک خاص

شہابی تبسم کی دمک سے جگمگانے لگا۔ اس کے لمبے لمبے بال ہوا میں ہل رہے تھے اور شفق کی روشنی میں اس کے چہرے سے غیض و غضب ظاہر ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ ایک شاندار دیوی کی طرح کھڑا رہا اور اس کی زبان غصہ اور نفرت سے باہر نکلی رہی لیکن پھر اس کے چہرہ کی دمک دور ہوگئی۔ اور اس کی جگہ سختی آگئی۔ اور وہ افسردہ اور بوڑھا معلوم ہونے لگا۔ پھر دبی ہوئی آواز سے بولا۔

" لیکن میری طرف سے سب کو غلط فہمی ہے، خاص کر اس دنیا کے باشندوں کو، میں نے صرف اپنی خاطر بغاوت نہیں کی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ میں اس کے خیالات اور ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قدر قاہر خود پسند اور خود غرض تھا۔ اس نے سب جاندار چیزوں کے مختلف طبقے بنا دیئے تھے یعنی فرشتوں، انسانوں، اور جانوروں کے تاکہ جنگ کے موقع پر ان کو ایک دوسرے سے لڑا دے اس نے ایک جنت بنائی اور ایک دوزخ تاکہ ان کو صلہ دے جو اس کی طرف ہیں۔ اور ان کو سزا دے جو اس کے خلاف ہیں۔ اور میں نے اس لئے بغاوت کی کہ میں اس کے ظلم اور طاقت کا خاتمہ کر دوں لیکن تم بھی جو خود پیروں تلے کچلے جاتے ہو اور برباد کئے جاتے ہو مجھ کو نہیں سمجھتے اور مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ اس خیال سے میری تنہائی اور مایوسی اور بھی بڑھ جاتی ہے لیکن میں —— تنہا ہوں اور اپنی دردبھری داستان کیسے جا سناؤں میں کس کی آغوش میں پناہ لوں . . . . ؟"

وہ خاموش ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں درد و یاس کی ایک عجیب کیفیت نمایاں ہوگئی اور اس کے ہونٹ اس طرح لٹک پڑے جیسے وہ انسان کی بزدلی پر اس کا منہ چڑھا رہا ہو۔ وہ اسی طرح کھڑا ہوا تھا کہ کونے میں الماری کے پیچھے سے ایک اور شخص آتا دکھائی دیا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ابلیس تھا۔ اس کا متین اور بڑا چہرہ پرسکون تھا شفق کی روشنی اس کی چوڑی پیشانی پر پڑی اور اس کے تاثر سے سر کو جھکا دیا اس کے چپکیلے جبڑے اندھیرے میں اور زیادہ چپکیلے معلوم ہونے لگے اور ان کا گٹھا ہوا

جسم اور بھی زیادہ مضبوط معلوم ہوتا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ طاقت کا پتلا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور شیطان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے سنجیدگی سے بولا:۔

"ہم تمہاری بغاوت کی داد دیتے ہیں تم نے خدا کے مظالم کے خلاف جہاد کیا۔ اور میں نے انسان کے مظالم کے خلاف جھنڈا بلند کیا۔ مگر ہم تم سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔ تم تخلیق کو فنا کرنا چاہتے تھے ہم انسانی افزائش کو دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ایسی دنیا بسانا چاہتے ہیں جس میں سب کا رتبہ برابر ہو جہاں ذات پات اور جماعتوں کی تمیز مٹ جائے۔ ایک ایسی دنیا جس میں ہر شخص اپنی ہمت کے مطابق کام کرے اور اپنی ضرورت کے مطابق روزی پائے۔ مجھے کم از کم ایک ملک میں تو کامیابی ہو گئی ہے لیکن آج کل دنیا میں بہت سے تاریخی واقعات ظہور میں آ رہے ہیں۔ بہت سے ملکوں کے محنت کش اور مزدوری کرنے والے ہر قسم کے مظالم کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ بہت جلد دنیا مظالم اور نکالیف سے پاک ہو جائے گی۔ ۔ ۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور اس کے چہرہ پر پیشن گوئی کی چمک جھلک اٹھی۔ مگر پھر وہ شیطان سے مخاطب ہو گیا:۔

"لیکن تم بہت خود پرست ہو تم خدا سے اس لئے حسد کرتے ہو کہ اس نے تمہارا جوڑا نہیں پیدا کیا لیکن ہم ذاتی بغض و حسد کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ہم تو مصیبت زدہ انسانوں کے حقوق کے لئے لڑتے ہیں چاہے وہ دماغی ہوں یا جسمانی ہمیں اس قسم کی ذاتی بغاوت میں کوئی دلچسپی نہیں جو تم کر رہے تھے۔ ہم تو انقلاب اور انسان کے حقوق کے لئے لڑتے ہیں۔ تمہارا مقصد پست تھا اور تم ناکامیاب رہے۔ ہمارا مقصد بنی نوع انسان کے معیار کو بلند کرنا ہے ——— اس لئے ہم کامیاب ثابت ہوں گے۔ ۔ ۔"

یہ کہہ کر وہ رخصت ہوا لیکن اسی وقت ایک اور شخص کمرہ کے ایک تاریک کونے سے نکل کر آیا اور مجھے یہ دیکھ بہت تعجب ہوا کہ وہ میرے مشہور دوست تھے مگر انہوں نے میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا اور لینن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس کو روکا اور کہا۔

"براور لینن ذرا رُک جاؤ۔ میں تمہاری تصویر بنانی چاہتا ہوں۔ یہ میرے لئے بڑے فخر کی بات ہوگی۔ براور لینن۔ ۔ ۔"

لیکن میں بول اُٹھا:۔

"ہاں ہاں، براور لینن کی تصویر بناؤ اور اس تصویر کو میں رکھوں گا۔ ۔ ۔"

میرے منہ سے یہ لفظ نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ شیطان چھلانگ مار کر کمرے سے باہر نکل گیا اور لینن اور اُس کے پیچھے پیچھے میرے مصوّر دوست ایک الماری کے پیچھے غائب ہوگئے۔ جب میں نے بجلی جلائی تو دیکھا کہ کمرہ میں کوئی بھی نہ تھا۔ شیطان کا بت اپنی جگہ سے دُنیا کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اور لینن کے چہرہ پر سکون اور شانتی تھی اور میرے دوست کی تصویروں میں اُن کے چہرہ پر درد اور جد و جہد کی کشمکش تھی۔۔۔

مجھے اس گفتگو پر بڑا تعجب ہوا جو میں نے سُنی تھی اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا۔ اُس سے متحیّر تھا۔ اس حیرت اور تعجب میں کھویا ہوا میں کمرہ سے باہر نکلا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور تارے زمین سے چشمک کر رہے تھے درخت خوشی اور وجد میں سر دھن رہے تھے اور ہوا کی سرسراہٹ میں ایک رنگین اور خوشنما دُنیا کے خوابوں کا نغمہ سنائی دے رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"مگر سندر اور نوجوان"

"اور بیچاری کا بچہ بھی تو مر گیا"

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کون مر گیا"

"ایک عورت ریل کے نیچے آگئی ہے"

پگلا جواب تک خاموش کھڑا تھا چیخ کر بولا "ارے پگلو، ایک عورت نہیں تین عورتیں تین" اور پھر بڑبڑانے لگا "رام رام ست ہے! دھت تیرے کی!

احمد ندیم قاسمی

جلسہ

غریب ہندوستان کے امیروں کا ایک غریب قصبے میں جلسہ ہونے والا تھا۔ دُور دُور سے بڑے بڑے مقرر آئے تھے۔ ڈھیلی ڈھالی عباؤں اور موٹے سیندوری تلکوں والے مقرر جن کے سفید کھدر کے لباسوں سے عطر کی لپٹیں جھلکی پڑتی تھیں۔ اور جن کی بھری بھری کلائیوں پر تین تین سو روپیہ کی سنہری گھڑیاں سج رہی تھیں۔ ان کی لچھے دار تقریروں کے سننے کے مشتاق دہقان جن کے جسم کے مسام مہین دھول میں اٹے رہتے تھے اور جن کی کلائیوں پر موٹے موٹے مٹیالے بال لپٹے رہتے تھے۔ قصبے میں آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ قصبہ شہروں سے بہت دُور ایک گھنے جنگل کے کنارے پر تھا۔ اُس کے مغرب کی طرف ایک برساتی نالہ تھا جس میں گاؤں کے بچے گول اور صاف چقماق کے گھروندے بنا کر لال بادشاہ سبز پری اور کالے دیو کا سوانگ بھرا کرتے تھے۔ اور گاؤں کے مشرق کی طرف ایک بہت بڑا کھنڈر تھا جس کے متعلق قصبے

میں یہ عجیب و غریب بات مشہور تھی کہ جب طوفانِ نوح آیا تو یہ محل آسمانوں سے اُن لوگوں کے لئے اتارا گیا جنہوں نے غریبوں کے پیٹ بھرے اور مسکینوں کی دعائیں لیں یہ محل طوفان کے دوران میں ہوا میں لٹکا رہا۔ اور جب طوفان ختم ہوا اور سمندر خشکیوں میں تبدیل ہو گئے اور خشکیاں سمندروں میں۔ تو اس محل کو چار فرشتے ہوا سے اتار کر یہاں لے آئے کہ غریبوں کے پیٹ بھرنے والے اور مسکینوں کی دعائیں لینے والے اطمینان سے باہر نکل سکیں لیکن یہ دیکھ کر محل کو سہارا دینے والے فرشتے پتھر کی بے جان مورتیوں میں تبدیل ہو گئے اس محل سے کوئی انسان باہر نہ آیا۔ صرف ایک بوڑھا سا کوا لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور اپنے ٹوٹے ہوئے پر پھڑپھڑاتا دور کچی پکی جھاڑیوں کے جھنڈوں میں غائب ہو گیا۔ کہتے ہیں اس کوے نے صرف اس لئے ایک ننھے کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا نہیں چھینا تھا کہ اسے اس کی معصوم آنکھوں میں تین دن کی بھوک دم توڑتی نظر آئی تھی۔!

باہر سے آئے ہوئے مفکروں نے اس محل کے پُراسرار کھنڈر دیکھے تو حیران ہوتے رہے کہ لوگ اگلے وقتوں کی بے سمجھے بوجھے کیوں تعریفیں کرتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ نکلا کہ اس محل میں قدم دھرنے کا مجاز ہو سکتا۔ اور آج اس زمانہ میں—کہ یہ زمانہ سب زمانوں سے بُرا سمجھا جاتا ہے — ہم لوگ راتوں کی نیندیں اور دنوں کے آرام کو حرام کر کے تپتی دوپہروں میں سفر کرتے ہوئے اس قصبے میں آتے ہیں صرف اس لئے کہ غریبوں کو جینے کا سلیقہ سمجھا سکیں۔ اور مسکینوں کی دلجوئی اور دلداری کریں۔ ان چار سفید مورتیوں کے پروں اور سروں پر ہاتھ پھیرے گئے جنہوں نے اس محل کو طوفان کے دوران میں اپنے کاندھوں پہ اٹھائے رکھا۔ ان میناروں پہ آنسو بہائے گئے جو جھکی ہوئی چھتوں پہ لیٹے جیسے دم توڑ رہے تھے۔ ان سیڑھیوں کو بہت احترام سے چھوا گیا۔ جن پہ اُن وقتوں کوئی انسان قدم نہ رکھ سکا!

شام کے وقت ایک میدان میں گیسوں کی روشنی کی گئی گاؤں والوں نے چندہ جمع کر کے گیس، پھل اور ایسی ایسی چیزوں کا انتظام کر رکھا تھا جن کا انہوں نے

کبھی نام تک نہ سنا تھا۔ بچے جوان اور بوڑھے اپنے دو گزے پٹکوں کے کنارے (بفضلِ اللہ) تہیں
دو تھوڑی سوکھی روٹیاں پشاوری گڑ اور پیاز باندھے دور دور سے چل کر آئے اور اسکول
کے ماسٹر جی نے برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی کے سفید گول پتھر اور بھورے اور گلابی
عقاق چن کر میدان کے عین وسط میں ایک دائرہ بنایا جس کے اندر قدم دھرنا دہقانوں
کے لیے قتل سے بڑا جرم تھا۔ اُس دائرے میں بہت چوڑے اور اونچے تختوں پہ ذیلدار
رئیس خاں صوبیدار اللہ دین۔ پٹواری لیکھ چند ماسٹر عطا اختر بی اے اور جمعدار انوپ سنگھ
کے ہاں سے کرسیاں اور میزیں اکٹھی کر کے سجائی گئیں۔ علاقے میں سرسوں کے پھولوں کی
کثرت تھی۔ اس لیے جگہ جگہ چوبی دروازوں پر سرسوں کی پھول بھری ڈالیاں لپیٹی گئیں۔ اور
پنڈال کو سرسوں کے پھولوں کی زنجیریں پہنا کر جکڑا گیا۔ اس زعفران زار میں بیٹھے ہوئے
ڈھیلی ڈھالی عباؤں اور موٹے سبز دری تلکوں والوں کی گردنوں میں چنبیلی کے ہار تھے جو
شہر سے منگوائے گئے تھے اور گو وہ پیارے لال ڈرائیور اور نند لال کلینر کی نالائقی کی
وجہ سے مسلے گئے تھے مگر آخر وہ چنبیلی کے ہار تھے اور شہروں سے منگوائے گئے تھے سرسوں
کے پھول خوبصورت نہیں مگر ان میں چنبیلی کی سی بو باس کہاں۔ اور پھر چنبیلی کا عطر بنتا ہے
اور سرسوں کا تیل ——— اور اس لیے مسلے ہوئے ہاروں سے اُن کی گردنیں پھٹی پڑی پڑتی تھیں۔
تھیں۔ پنڈال پر اِن مہمانوں کے لیے دریاں بچھائی گئیں تاکہ ان کے جوتوں کے تلوے
میلے نہ ہوں۔ ساتھ لٹکا کر کے ہر طرف خاک کے بھورے قطعوں پر جفاکش دہقان لاٹھیاں
زمین پر ٹیک لگائی اور فرط شوق سے بیٹھ کر کہتے تھے "اب کب اٹھیں گے مولوی جی"

اور " من کا دانا" اب رہنے دو مولوی جی کو۔ وہ جو گیا بابا بیٹھے جو پنڈت جی
بیٹھا ہے دو ہک میں سنہرا اٹھا ہے۔ راج کشور دوکاندار کہہ رہا تھا کہ جب وہ
گانے لگتا اور پیٹ۔ تن اور تنا ہے جیسے کسی لڑکی کے کنگن سے کانسی کا کٹورا ٹکرا گیا اور
اُس کی پھیروں میں ہل چلانے انوں میں گونجتی رہی۔ آواز کی لہروں میں ایسی گٹکڑیاں چھوڑتا
ہے کہ اُن اڑانے والیوں کے تو۔ وہ ناگ بل کھائے تھر کا جا رہا ہے۔ رہنے دو مولوی جی

بھی اٹھ رہا ہے۔ لے سُن ما"

دم بخود مجمع کی نظریں ایک بزرگ پر پڑیں جنہوں نے ایک ڈھیلی ڈھالی سبز عبا پہن
رکھی تھی۔ وہ آرام کرسی پر سے کھنکارتے ہوئے اُٹھے۔ اُن کے پھولے ہوئے گال گیس
کی سفید روشنی میں دمک رہے تھے۔ جیسے دہقانوں کے رخساروں کی ابھری ہوئی
سانولی ہڈیوں کی پھبتی اُڑا رہے ہوں۔ عربی زبان میں دو چار جملے گنگنا کر اُنہوں نے اپنی
لوچیلی آواز کو بلند کرتے ہوئے فرمایا: "میں جو اتنے لمبے کٹھن سفر طے کر کے آیا ہوں تو یہ
سب تم بھائیوں کے بھلے کے لیے۔ مرحوم والد محترم کے عرس شریف کے تمام انتظامات
اپنے چھوٹے بھائی کے سپرد کر کے صرف اس خاطر حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے دلوں پر سے
مایوسیوں کے بھاری پردے اُٹھا سکوں اور بتا سکوں کہ دعا میں کتنی قوت ہے۔ ذاتی طور
پر میرا تو دعا میں اس قدر یقین ہے کہ ہل چلانا چھوڑ دو۔ کام کے پاس نہ پھٹکو۔ لمبی تانے
پڑے رہو مگر پانچ وقت نماز کے بعد اپنے خدائے علیم و بصیر کے حضور میں خشوع و خضوع
سے سر رگڑنے کے بعد سچے دل سے گڑگڑا کر دعا مانگو۔ رقت قلب سے روؤ۔ اور کہو کہ اے
پروردگار بے ہمتا اور اے آقائے سلسبیل، ذلیل ہم دُکھیوں کی فریاد سُن۔ ہم تیرے در کے
کتے۔ تیرے دربار کے بھکاری تیرے حضور سربسجود ہیں۔ تو ہم پر اپنے بے پایاں انعام و
اکرام کی بارشیں برسا۔ میں کہتا ہوں ——— میں کہتا ہوں کہ — یہاں اُن کی آواز بھرا
گئی اور آنکھیں تر ہو گئیں، میں کہتا ہوں اس طرح تمہاری مصیبتیں پل جھپکنے میں کافور
ہو جائیں گی اور تم امن چین سے اپنی زندگیاں گزار کر بہشت کو چلے جاؤ گے۔ دعا ایک
ایسی زبردست قوت ہے۔ دعا ایک ایسا تیز ہتھیار ہے کہ جسے رکھا۔ ان میناروں کے دیو کو بلا
کیا جا سکتا ہے اور عشرت کے دروازے وا کیے جا سکتے ہیں۔ تھے ان سیٹھ ہوشیار ہونا چاہیے
دعاؤں میں اثر پیدا کرنے کے لیے دل کی صفائی ضروری ہے۔ رکھ سکا! تی صرف
بزرگوں اور مہاپرش درویشوں کے آستانوں پر جبیں سائی ہی روشنی کی گئی۔ گاؤں کی قبروں پر
چڑھاوے چڑھاؤ۔ قربانیاں دو۔ مزاروں پر قوالی کرانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جس کا مبارک

کام میں جی کھول کر حصہ لو۔ بزرگوں کی اولاد کی خدمت کرو۔ تم ایک دو گے تو اللہ تمہیں
سنر عطا کرے گا۔ تمہارا قلب آئینے کی طرح صاف ہو جائیگا۔ اور تم پر کائنات کے چودہ طبق
روشن ہو جائیں گے' میرے مرحوم والدِ محترم کے حضور ایک بار ایک بھوکا شخص آیا اور...

.... اور یوں حضرت منقر اپنے مرحوم والد صاحب کی قصیدہ گوئی
میں کھوئے گئے۔ بے چارے دہقان سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند کر رہے تھے اور
اور شدتِ جذبات سے مجبور ہو کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ اور بہت پرے کانٹوں کی
ایک باڑھ کے اُس طرف گاؤں کی عورتوں کا جمگھٹ یوں کھڑا تھا جیسے کسی مصوّر نے
آسمان سے اُتری ہوئی اور دھندلکوں میں لپٹی ہوئی حوروں کی ایک تصویر کھینچ دی ہے
گیس کی مدھم روشنیوں میں اُن کے کنگن اور کنٹھے چمکتے تو لوگوں کی نظریں از خود اُدھر
اُٹھ جاتیں اور وہیں گڑی رہ جاتیں۔ اور پھر مولوی صاحب کی یہ آواز انہیں کنگنوں اور
کنٹھوں اور اُن کے ہمراہ کنگنوں اور کنٹھوں والیوں کی جنت سے اُٹھا کر اس بھوری خاک
پر پٹخ ڈالتی کہ "آخرت سے ڈرو۔ قیامت سے ڈرو۔ اور پیر کی بد دعا سے ڈرو۔ بزرگوں کے
مزاروں پر چڑھاوے چڑھاؤ۔ ان کی اولاد کی خدمت کرو۔ میں اسی لئے اتنے لمبے کٹھن
سفر طے کر کے تمہارے پاس آیا ہوں!"

اور اس کے بعد ایک پنڈت جی اُٹھے جن کی آواز میں واقعی ایک جادو سا تھا۔ سنہرے
عصے کو کرسی کے ساتھ لٹکا کر اور گلے میں لپٹی ہوئی چادر کو ڈھیلا کر کے اُنہوں نے ایک لمبی
اور دردناک کنگری لگائی اور فرمایا ؎

من کا دیا جلایا — میت کے درسن کر کے
دو جگ میں گھوم آیا — پیت سے من کو بھر کے

اور یوں پیت اور میت۔ تن اور من۔ دکھ اور سکھ کا ایک جال تان کر وہ خاموش ہو گئے
اور تپتی دوپہروں میں ہل چلانے والوں اور دہکتی چٹانوں پر چڑھ کر باجرے کی فصلوں
سے چڑیاں اُڑانے والیوں کے دلوں کو دھڑکتا چھوڑ گئے۔ لیکن اچانک اُنہوں نے

ایک اور رنگ بدلا۔ اور پکارے "منترو! میں تمہارا ایک ادنیٰ داس تمہارے چرنوں میں
صرف اس لئے آیا ہوں۔ کہ میں ایک ایسے اناتھ آشرم کے لئے آپ سے مدد مانگوں جس
کی نیو میرے ہی ان پاپی ہاتھوں نے رکھی تھی اور جس میں اس نگری کے اناتھ بالک ودیا
کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ چرخہ کاتتے ہیں اور آگے جا کر جیون میں آنند اور سکھ پاتے
ہیں۔ میرے جیون میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمان اور ہندو بھائی اپنے بھلے کی باتیں سوچنے
کے لئے اکٹھے بیٹھے ہیں میں اسے بھارت ماتا کے لئے ایک شبھ گھڑی سمجھتا ہوں اور آشا
کرتا ہوں کہ میرے بھائی میرا ہاتھ بٹا کر اور پن کر کے خورسند ہونگے۔ جلسہ گاہ کے باہر چند
منش میرے جیسا ہو گیا باتا پہنے اور جھولیاں بڑھاتے کھڑے ہونگے۔ جاتے ہوئے انکی
جھولیاں بھر دو کہ تمہیں جیون میں سکھ اور پرلوک میں شانتی ملے۔ رام رام"

"کیا کہا اس نے" ایک طرف سے آواز آئی۔

اور ادھر سے جواب ملا "پنڈت جی نے کہا ہے کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔
اور بہت جلد ہماری سرکار قحط سالی کی وجہ سے لگان معاف کر دے گی۔ اور رام سب
کا بھلا کرے!"

یہ بات سننے والے نہایت احترام سے پنڈت جی کو دیکھنے لگے۔ جو اب منہ میں پان
اور انگلیوں میں سگرٹ رکھے ہوتے تھے۔ اور گو پان کا پتہ سوکھ چکا تھا اور سگرٹ پر شیر
کا نشان تھا۔ مگر آخر وہ پان اور سگرٹ تھے۔ اور انہیں مقدس مہمانوں کیلئے شہروں
سے منگائے گئے تھے۔

بہت لمبی لمبی تقریریں ہوئیں نظمیں پڑھی گئیں۔ نعرے لگائے گئے۔ اسمبلی کے ایک
ممبر نے نہایت فخریہ انداز میں کہا "مجھے دیکھو۔ میں تمہارا ایک ادنیٰ خادم سرکار عالی کے
حضور تمہاری شکائتیں پہنچاتا ہوں اور تمہاری داد رسی ہوتی ہے۔ میں اپنا گھر بھول گیا۔
بال بچوں کا مجھے خیال تک نہیں۔ میری زمینیں پڑی برباد ہو رہی ہیں۔ لیکن آپ غریب
بھائیوں کی خدمت کیلئے مجھے سب کچھ منظور ہے۔ اگر تم میرے چمڑے کی جوتیاں پہن کر

چلنا چاہو، تو میرا چھپڑہ حاضر ہے، اور اب عنقریب نئے انتخابات آنے والے ہیں۔ کئی سرپھرے یہاں آکر میرا مقابلہ کریں گے، اور مجھے تم سے امید ہے کہ . . . . "

یونہی قسم قسم کی تقریریں ہوئیں دہقانوں کے بھلے کی اسی طرح تجویزیں سوچی گئیں دو دو دن کے لئے ہل چلانے کو ملتوی کرنے والوں کو زندہ رہنے کا سلیقہ سمجھایا گیا۔ اور اس دوران میں سگریٹ اڑائے گئے۔ پان چبائے گئے۔ شربت لنڈھائے گئے اور چندے مانگے گئے۔ دہقان بھوری خاک پر آلتی پالتی مارے بیٹھے نہایت توجہ سے یہ باتیں سنتے رہے۔ جو اُن کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ جب اسمبلی کے ممبر صاحب اُٹھے تو تمام جلسہ گاہ میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ "ہماری سڑک برباد پڑی ہے۔" "ہمارے لئے پانی کا انتظام نہیں" "ہمارے فصل تباہ ہیں مگر لگان معاف نہیں ہوا۔" "تھانیدار ہمیں بیگار پر پکڑ کر تنگ کرتا ہے!" لیکن ایک بوڑھے نے چپکے سے یہ نشتر سب کے دلوں میں چبھو دیا کہ "مالک بڑا آدمی ہے اشارہ کردے تو تم سب حوالات میں گلتے سڑتے نظر آؤ۔ رہنے دو اپنی سڑکوں کو اور فصلوں کو تقریریں سنو اور اللہ کی قدرت دیکھو!" ——— اور اچانک تمام مجمع پر موت کا سا سکوت چھا گیا۔

اس کے بعد ذیلدار رئیس خاں اُٹھا۔ اُس کا گز بھر لمبا کلف لگا طرہ ہوا میں جھوم رہا تھا اور ریشمی ملبوس کی لہریں گیس کی روشنی میں کروٹیں بدل رہی تھیں۔ اُس نے نہایت نپے تُلے الفاظ میں ایک ایسی ہستی کا تعارف کرایا جس کی وجہ سے ذیلدار کے الفاظ میں یہ جاہل قصبہ آج بہشت بنا ہوا تھا۔ یہ صاحب گاڑی اور موٹر کار کے ذریعے ایک لمبا کٹھن سفر طے کر کے یہاں تشریف لائے تھے۔ چالیس پینتالیس کا سن۔ داڑھی اور مونچھوں میں اس قدر تیل پڑا ہوا کہ گیس کی روشنی میں اُن کے بال چاندی کے تار معلوم ہوتے تھے۔ کھدر کا لباس اور سر پر گاندھی جی کی ٹوپی جسے خود گاندھی جی نے پہننا ترک کردیا ہے! اُٹھے اور جھک کر آداب بجا لائے اور فرمایا "میرے خاک پر بیٹھے ہوئے بھائیو۔ میں تم سے بہت لمبی باتیں نہیں کروں گا۔ دو چار نکتے سمجھاؤں گا۔ کہ انہیں میں تمہا

بھلا ہے پندرہ سال ہوتے ہیں تمہارے قصبے میں آیا تھا۔ اور میری تقریر کے اثر سے تم
نے ترکی اور گاندھی ٹوپی پہن لی تھی۔ اور ہاتھوں میں سبز اور پیلے جھنڈے تھام لئے تھے
میں دو مہینے کے لئے جیل میں تمہاری خاطر چکی پیستا رہا۔ اور تمہاری قربانیوں کی داستانیں
سنتا رہا۔ آج میں تم سے نہیں بلکہ تمہاری ماؤں بہنوں بیویوں اور بیٹیوں سے مخاطب ہونگا
کہ سب سے پہلے ہمیں عورتوں کے سدھار کی ضرورت ہے۔ عورتیں ہماری آنیوالی نسلوں
کی امانت دار ہیں ہمیں اپنی فلاح و بہبود سے بڑھ کر اُن کی فلاح بہبود کا خیال رکھنا
چاہیئے۔ وہ ہماری اجڑی ہوئی محفلوں کی زینت اور ہمارے دُکھے دلوں کا سہارا ہیں۔
وہ ہماری مجلسوں کا حُسن اور ہمارے گھروں کی رونق ہیں (اور یہاں اُن کی آواز بھرا گئی
اور باڑ کے پرے کنگن کے کنٹھے جھلملانے لگے) اگر وہ پریشان اور فکرمند ہیں تو ہمارا آرام
و اطمینان کس کام کا۔ پچھلے چند دنوں سے معدے کی شکایت کی وجہ سے میرے گلے
پہ بھی اثر پڑا ہے۔ اس لئے میری آواز بہت جلد تھک جاتی ہے۔ شاید کانٹوں کی باڑ کے
پرے میری آواز نہ پہنچ سکے میں اپنی بہنوں سے گذارش کروں گا۔ کہ اگر وہ باڑ کے اک
طرف سے ہوکر جلسہ گاہ کے قریب آجائیں تو مجھے بھی تکلیف نہ ہوگی۔ اور اُن کا بھی بھلا
ہوگا ـــــ شربت کے دو گھونٹ دیجیئے گا!"

کنگن اور کرشئے گیسوں کی سفید روشنی میں چمکنے لگے اور عورتیں ڈری ہوئی بھیڑوں
کی طرح تیز تیز ہونے لگیں۔ دو چار ٹولیاں قصبے کی طرف چلدیں اور دو چار جلسہ گاہ کے
قریب آگئیں۔ مگر ان قریب آنے والیوں کی کلائیوں میں کنگن نہ تھے۔ یہ قصبے کی بڑی
بوڑھیاں تھیں۔ اور جانے والیاں وہ معصوم کنواریاں اور باحیا دلہنیں تھیں۔ جو گیس کی
سفید روشنی میں غیر مردوں کی نظروں کے جنگل میں گھر جانا شاید بُرا سمجھتی تھیں!

میرے قریب ہی ایک بہت بوڑھا شخص نسوار کی ڈبیا کو انگوٹھے سے بجاتے ہوئے
بولا "بچے۔ یہ مولبی کون ہے؟"

بھائیو میں نے اُسے مولوی جی کا نام بتایا۔ تو اچانک اُس کے دق چہرے پر شکنیں بننے لگیں

ہاتھ سے فسادی کی ڈبیا چھوٹ کر نہ بند پہ گر گئی بحیثیت آنکھوں کی بینائی جیسے کافور ہو گئی ناک کی ہڈی اور ماتھے کے ابھار پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ اٹھا اور لڑکھڑا کر مجھ پہ آن گرا۔ پھر اٹھا اور چیختا ہوا پنڈال کی طرف بڑھنے لگا "ارے رستہ دو مجھے ——— ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ——— جانے دو مجھے ——— مجھے روکو نہیں میں آج مدتوں کا بھولا ہوا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں"

وہ گرتا پڑتا بازو جھٹکاتا آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ پگڑی کھل کر اس کی گردن میں اٹک گئی۔ پھٹا ہوا لباس پھڑپھڑانے لگا۔ وحشیانہ انداز میں پنڈال پہ نظریں گاڑے وہ چلائے جا رہا تھا "مجھے رستہ دو۔ جانے دو مجھے!"

پہلے تو لوگ چپ چاپ بیٹھے اسے گھورتے رہے مگر جب پنڈال پہ ذیلدار کی طرف دیکھا جو بوڑھے کو قابو میں لانے کے احکام صادر کر رہا تھا۔ تو سارا مجمع کھڑا ہو گیا۔ ذیلدار کا طرہ کئیں کے پاس لہرانے لگا۔ اور مولوی جی کرسیوں کی آخری قطار تک پیچھے ہٹ گئے۔ ادھر سے دو کالے رنگ کے چوکیدار جھپٹے۔ اور بوڑھے کو دبوچ کر مجمع سے باہر لے گئے۔ لوگوں کی افراتفری سے اٹھا ہوا گرد و غبار دھندلے مرغولے بن کر کرسیوں کے آس پاس منڈلانے لگا۔ لوگ ایک دوسرے سے اس بوڑھے کے متعلق پوچھنے لگے میں نے ابھی ایک شخص کو کاندھے سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "اسے بھائی۔ یہ بوڑھا کون تھا!"

"خدا جانے"

پیچھے سے ایک بوڑھے نے میری پیٹھ کو چھوتے ہوئے کہا "بڑے میں بتاؤں بچے"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے گاؤں کا بوڑھا دھوبی بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ لال مسوڑوں کے پیچھے اس کی گول مول زبان کانپ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولا "اے بیٹا احمد تو بھی خاک پہ بیٹھ گیا؟ وہاں کرسیوں پہ تجھے کوئی جگہ نہ ملی؟ بی۔ اے۔ پاس اور دھول پہ بیٹھے۔ لے یہ چادر بچھا دوں!"

میں نے کہا "بابا رہنے دے چادر کو۔ مجھے اس بوڑھے کے متعلق کچھ بتا"

اُس نے مجھے قریب کھسک آنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنے ڈھیلے ڈھالے ٹھنڈے بے رونق ہونٹ میرے کانوں کے بہت قریب لا کر بولا "سُن۔ یہ بوڑھا، ذیلدار رئیس خاں کا مزارعہ تھا۔ اس کی زمین پر ہل چلایا کرتا تھا۔ پندرہ سولہ سال گزرے یہی مولوی گاؤں میں آیا۔ اُس کی خاطر مدارات کے لئے ذیلدار نے ہر گھر سے چندہ اکٹھا کیا بڑھاپے بیچارا غریب آدمی چندہ ادا نہ کر سکا۔ ذیلدار نے اُسے گھُرکا اور کہا کہ وہ چندہ لئے بغیر چین نہ لے گا۔ اور پھر تم یہ سُن کر حیران ہو گئے کہ اُس نے بوڑھے سے چندہ لے لیا وہ یوں کہ رات کو کسی وقت جب بوڑھے کی آنکھ کھلی تو اُس کی اکلوتی جوان لڑکی کا بستر خالی پڑا تھا۔ وہ ذیلدار کے گھر کی طرف بھاگا۔ اور وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ذیلدار ایک کمرے کے باہر خود ہی ایک لٹھ تھامے بیٹھا ہے۔ ذیلدار کا اشارہ پاتے ہی ایک کتا ایک طرف سے جھپٹا اور بوڑھے سے لپٹ گیا۔ اُسے کئی جگہ سے کاٹ کاٹ کھایا لیکن بوڑھا آگے بڑھتا گیا۔ اور ذیلدار سے جا کر پوچھا میری لڑکی کہاں ہے اور ذیلدار نے اُسے بتایا کہ وہ اندر مولوی جی کے پاس ہے۔ اور تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ تیری لڑکی اپنا کنوار پن لٹا کر تیرا چندہ ادا کر رہی ہے! بوڑھے نے چیخنا چاہا مگر ذیلدار کی لٹھ سیدھی اُس کے دماغ پر پڑی۔ چوکیدار اُسے اُٹھا کر باہر گلی میں ڈال آئے۔ اُس دن سے اُس کا دماغ چل گیا ہے کسی سے بات نہیں کرتا۔ جو شخص ملے اُسے پاگلوں کی طرح گھورتا اور نسوار کی چٹکی منہ میں رکھ کر آگے چل دیتا ہے۔"

"اور اُس کی لڑکی" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی سنو گے؟" بوڑھے نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "کہتے ہیں وہ صبح کو مولوی کے چنگل سے نکل کر برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی میں بیٹھی رہی۔ لوگ اُسے سمجھانے بجھانے آئے لیکن وہ وہیں پڑی رہی۔ اُس کے بال کھلے تھے۔ چولا پھٹا ہوا تھا۔ اُسے کوئی احساس نہ تھا کہ اُس کا سینہ نظر آ رہا ہے اور اُس کی پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ چار دن کے بعد وہاں سے اُٹھ کر کہیں چلی گئی۔ کہتے ہیں آج کل [illegible]

کے جنگلے میں بیٹھی ہے!"

گیسوں کی روشنیوں میں لپٹے ہوئے مولوی نے کھنکھار کر کہا: "میں اپنی بہنوں کو کس طرح سمجھاؤں کہ آنکھیں نیچی کر کے چلنے میں کتنا بڑا ثواب ہے۔ میں اپنی ماؤں کو ——!"

اور اچانک ایک کمزور سا بھولا بھٹکا کوا کھنڈر کی طرف سے رات کے اندھیرے میں پھڑپھڑاتا ہوا آیا اور مولوی کے سامنے ایک گیس سے ٹکرا کر نیچے گر گیا اور پنڈال کے تختوں تلے گھس کر چھپ گیا۔ بہت دور بوڑھے کی دبی دبی چیخ سنائی دی: "مجھے آج مدتوں کا بھولا ہوا فرض ادا کرنے دو!" —— اور تاروں بھرے آسمان کے مقابل ابھرے ہوئے آسمانی محل کے کھنڈر کانپے، اور منجمد فرشتے جیسے اپنے سنگین پر پھڑپھڑا کر اسی طرح سن ہو کر رہ گئے!

موہن سنگھ

پیر بخش

"او بوڑھے شاہ! ذرا ٹھہر یو۔"

"کون ہو رے تم، اِس نکھبت؟" ——— بوڑھے شاہ نے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر کسی کو اندھیرے میں پہچاننے کی کوشش کی۔

"مَیں ہوں ذرا ٹھہر یو۔"

"آواج تو پیر بکس کی سی ہی جان پڑتی ہے" ——— کدھر کو چلے ہو اس نکھبت؟ اور یہ سر پہ کیا اُٹھائے ہو؟

"نمک ہے سالا، اُٹھا اُٹھا کر گردن ٹوٹ گئی ہے بٹھو کی پھلاہیوں کے پاس تمہاری ٹُنکاری کی آواز آئی تھی۔ میں نے کہا، ہو نہ ہو، بوڑھے شاہ ہی ہیں۔ اچھا تو یہ گدھی کدھر لئے جا رہے ہو؟"

پیر بخش نے بوجھ کے نیچے دبتے ہوئے پوچھا۔

"یونہی ذرا راولپنڈی تک چلا ہوں۔"

"اور یہ اِس پر لاد کیا رکھا ہے"؟

"بس کچھ دانے ہیں۔ اِن کو بیچ بٹول کر دوکان کے لئے کچھ سودا سپتا لے آؤں گا۔" یہ کہہ کر بوڑھے شاہ نے پیر بخش کو صبح کے جھٹپٹے میں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں جھٹ سے تاڑ گئیں۔ کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ اُس نے بڑے مزے سے گدھی کو ایک گالی دی۔ پھر اپنی گھنی مونچھوں سے کھچڑی سی آواز نکال کر بولا۔ "اچھا تو ٹنک کدھر لئے جاتے ہو؟ خیر تو ہے؟ کہیں پھر تو دیبالی کے ساتھ کھٹ پٹ نہیں ہو گئی؟"

"کیا پوچھتے ہو بوڑھے شاہ، رہنے دو۔"

"پھر بھی بات کیا ہے؟"

"بات کیا ہے، اِس بیوی نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

"کیا! ہوا کیا ہے آخر؟"

"ہونا کیا تھا، بس وہی اُلٹی عورت والی بات۔"

"ہیں . . . ایں؟"

"اُلٹی عورت کی بات نہیں سنی ہے کیا؟"

"نہیں تو۔"

"ایک تھی اُلٹی عورت اور ایک تھے الھڑ میاں، ایک دن کپڑے دھوتے اُلٹی عورت ندی میں بہہ گئی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا اور لگے ڈھونڈنے پانی کے بہاؤ کی طرف۔ دو تین میل نیچے نکل گئے مگر اُلٹی عورت کا نشان تک نہ ملا۔"

"ہوں . . . اوں، آگے؟" بوڑھے شاہ نے ہنکارا بھرا۔

"آگے کیا بتاؤں یار، دیکھتے نہیں ٹنک کے نیچے دم گھٹا جاتا ہے۔ اتنا نہیں کرتے کہ ذرا ٹنک کو گدھی پہ رکھوا لو۔" پیر بخش نے بھولا سا بن کر داؤ بھرا۔

بوڑھے شاہ بڑا ہیکڑ اور کائیاں دوکاندار تھا اور جہاں تک بس چلے کسی کے کام نہ آتا تھا

یوں بھی آج گدھی پہ کافی بوجھ تھا مگر یہ سوچ کر، کہ پیر بخش اور دُنیا بی کے اس نئے جھگڑے کو وہ گاؤں لوٹتے ہی کیسے نمک مرچ لگا کر سنائے گا، اُس نے ٹرنک اُٹھا کر گدھی پہ رکھ لیا۔ اور بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "گدھی کس کی اور گہنے کس کے۔ ٹرنک دُور رہا، چاہو تو تم بھی چڑھ بیٹھو۔ اچھا آ گئے؟"

"بس لوگ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک گئے مگر اُلٹی عورت کو نہ ملنا تھا نہ ملی جب مایوس ہو کر گھر لوٹنے لگے تو الھڑ میاں بولے" ملے تمہارا سر۔ وہ تھی اُلٹی عورت۔ اُس نے تمام عمر میرے ساتھ کوئی سیدھی بات نہیں کی۔ جو کہو اُلٹی، جو کہے اُلٹی۔ اگر ڈھونڈنا ہو تو پانی کے بہاؤ کی طرف نہ ڈھونڈو جس طرف سے پانی آتا ہے اُدھر ڈھونڈو۔ بس یہی بات دُنیا بی کی ہے۔ جو کہو اُلٹی۔ جو کہے اُلٹی۔ میرا تو اِس نے ناک میں دم کر دیا ہے"

"کیوں جھوٹ بکتے ہو، یار۔ مجھ سے کون بھولی ہوئی ہے، دُنیا بی۔ ہر روز میری دکان پر آتی ہے۔ نہ شکل بُری ہے نہ عقل۔ ایک ایک بات کرتی ہے لاکھ لاکھ روپے کی۔ بس کر نہیں کرتے بھگوان نے ایسی اچھی بیوی دے رکھی ہے" بوڑھے شاہ نے پیر بخش سے زیادہ حالات معلوم کرنے کے لئے اُس کی بیوی کا پہلو لیا۔

"دُور ہی کے ڈھول سہاونے لگتے ہیں۔ اگر ایک بھی دن دُنیا بی کے ساتھ کاٹنا پڑے تو ہوش ٹھکانے آ جائیں"

"نہیں یار، اتنی بُری تو نہیں" بوڑھے شاہ کی آنکھیں چمکیں۔

"تمہاری داڑھی نوچ کر تمہارے ہاتھ میں دے جب معلوم ہو بُری ہے یا نہیں"

"ہیں۔ . . ایں! داڑھی پہ پکی ہے۔ تب تو بھائی اُس نے بہت بُرا کیا"

"داڑھی کو رو رہا ہے۔ اگر اپنی آئی پر اُتر آئے تو باپ دادے تک کو نہیں چھوڑتی۔ ہر روز کہرام مچا رہتا ہے۔ ایک دن ہو تو کوئی صبر بھی کرے مجھ سے تو اُدھر بھی نہیں جاتی"

"واہ ری دُنیا بی۔ ای۔ ای۔ ای . . ." بوڑھے شاہ نے آنکھیں اور منہ پھاڑ کر حیرت ظاہر کی۔

"میں بھلا مانس آدمی اپنی عزت سے ڈرتا کچھ کہتا نہیں۔ وہ سر پہ ہی چڑھتی جاتی ہے۔

مگر اب بالکل ٹھیک ہو جائے گی بیں بھی اگر حلال کا ہوا تو گھر نہیں لوٹنے کا۔" پیر بخش نے جوش میں کہا۔

"اچھا تو اب چلے کدھر ہو؟"

"خدا کا ملک تھوڑا پڑا ہے۔ جانے کو کوئی روکتا ہے؟ جہاں جی چاہا دو نوالے کھا کر پڑا رہوں گا۔"

"چھوڑو یار، چھوٹی سی بات پہ بیوی کو چھوڑ دو گے کیا؟ آخر برتن کے ساتھ برتن کھنک ہی جاتا ہے۔"

"بوڑھے سنگھ! مجھ ایسا صبر والا ابھی تک کسی ماں نے جنا نہیں۔ یہ میں ہی ہوں جس نے دنیائی کے ساتھ بیس برس گزار دیئے۔ تم کیا جانو عورتیں کیا بلا ہوتی ہیں۔ بس دکان پہ بیٹھ کر رام گلم جپتے رہے اور جاٹنیوں کے ساتھ دل لگی کر لی۔ شکر کرو اللہ کا کہ شادی کے جال میں نہیں پھنسا۔"

"تم تو یار پیر بخش یونہیں ناراض ہو گئے۔ بُرا تو نہیں کہا کہ بستا ہوا گھر نہ اجاڑو۔"

"اسی لئے تو بیس برس ہو گئے ہیں مجھے صبر کرتے کرتے۔ مجھے تو احمد پور کے میاں جی کی بات مارتی رہی ہے جو چودہ پندرہ برس ہوئے مسجد میں وعظ کرنے کے لئے آئے تھے۔۔۔۔"

"کون، میاں رکن دین؟ بہت نیک آدمی تھے۔"

"ہاں، وہی۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے۔ کہتا تھا رسول کریم کا حکم ہے کہ جو مسلمان اپنی بیوی کے ساتھ بُرا سلوک کرے گا دوزخ میں جائے گا۔ اسی لئے تو میں نے دنیائی پہ کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ اور نہ کبھی بُرا بھلا کہا ہے۔ اگر بہت اکڑتی تھی تو کہا کرتا تھا بصرے چلا جاؤں گا بھرتی ہو کر۔ اس طرح دو تین سال تو دنیائی کی زبان دانتوں تلے رہی لیکن پھر کہنے لگ پڑی جا، چلا جائے گا۔ تو میری طرف سے کل کا جاتا آج ہی جا۔ ایک دن میں سچ مچ چلنے کے لئے ٹرنک میں کپڑے ڈالنے لگ پڑا۔ یہ دیکھ کر دُنیائی کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ لگی پاؤں پکڑنے۔ خیر، پھر جب کبھی اکڑتی تھی میں ٹرنک اُٹھا لیا کرتا تھا۔ اس طرح اور پانچ سال گزر گئے پھر کہنے لگ پڑی ـــــ جا، چلا جائے گا تو لے جا ساتھ اپنے باپ والا ٹرنک بھی۔ ایک دن میں

لہ دُنیا پی کے ساتھ
ا دہ اُسے علی الصبح
یا جب کہ دُنیا پی
الیقہ لگے تھے۔
ے یاد آیا کہ اُس نے
ی کی اوٹ میں مسکرا
ں۔ جس میں سے سب
ی موٹے کپڑے کیوں نہیں پہنتی ؟ تو
ں دُنیا پی نے شرم سے اور پیار میں
تے جو نکال نہ لوں" دُنیا پی کی یہ بات

دس برس پہلے کی دُنیا میں گھوم رہا تھا۔ اتنے میں دھم سے
ی مسافر نے اپنا اسباب گاڑی میں آ پھینکا۔ پیر بخش چونک پڑا سا تھ ہی اُس کے کانوں
میں گاڑی کی چیخ پڑی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے ٹرنک کو گھسیٹ کر اُس نے پلیٹ
فارم پر پٹک دیا۔ پھر دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی گاڑی میں سے کود پڑا۔ اور ٹرنک پر
اپنے سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ گیا۔
جب اُس نے سر اُٹھایا تو گاڑی جا چکی تھی۔ اُس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا تھا۔ اور
ٹرنک سر پہ اُٹھا کر گاؤں کی طرف لوٹ پڑا۔ جب وہ سہاں ندی پہ پہنچا تو اندھیرا چھا چکا تھا
یہاں سے اُس کا گاؤں ایک میل رہ گیا تھا۔ دور گاؤں کے تنوروں میں سے آگ کے شعلے
اُٹھ اُٹھ کر اندھیرے کی چادر کو پھاڑ رہے تھے۔ اُس کا جسم ٹرنک کے بوجھ کے نیچے تھک
گیا تھا مگر اُس کی چال میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ اندھیرے میں اُس کے پاؤں
سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح پگ ڈنڈی سے بال بھر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تھے۔

ٹیلے پہ پہنچکر اُس نے خانقاد کے پتھر پر ٹرنک رکھ دیا اور فاتحہ پڑھ کر پھر سے جلدی جلدی چلنے لگا۔ ٹیلے کے کوئیں پہ پہنچکر اُس کے پاؤں ایک دم رُک گئے۔ یہاں سے اُس کے گھر کی طرف دو راستے پھٹتے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ بڈھے شاہ نے گاؤں لوٹ کر سب بھانڈا پھوڑ دیا ہوگا۔ اور گاؤں کے ہر ایک باشندے کو اُس کی کرتوت کا پتہ چل گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر کہ بازار والے راستے پر اُسے کوئی مل نہ جائے، اُس نے دوسرا راستہ پکڑ لیا۔ جو باہر کھیتوں میں سے اُس کے گھر جا پہنچا تھا۔

جب وہ گھر کی دیوار کے پاس پہنچا تو اُس کا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ گھر کے اندر گھپ اندھیرا چھا ہوا تھا۔ شاید دنیا بی سو چکی تھی۔ وہ دبے پاؤں دروازے تک پہنچا اور چھپت کے پاس کان لگا کر سننے لگا مگر اندر سے کسی قسم کی آواز نہیں آتی تھی۔ لگ بھگ دس منٹ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ دیوار کے باہر دو آدمی باتیں کرتے کرتے گذر گئے۔ "اگر وہ مجھے دیکھ لیتے" پیربخش کا ڈر سے سانس رُک گیا۔ دروازے کے ساتھ منہ لگا کر اُس نے مری ہوئی آواز میں کہا، "نیک بختنی۔ ای۔ ای۔ ای۔ !"

کڑ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کڑ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کڑ ——— چارپائی پر سے کسی کے اُٹھنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی کواڑ کھل گیا۔ دُنیا بی محض ایک چادر میں اپنا جسم لپیٹے دہلیز پر آئی۔ وہ بالکل شانت اور چپ تھی۔ اُس کے گول گورے بازوؤں نے چادر سے نکل کر پیربخش کے سر سے ٹرنک اُٹھا لیا اور جلدی ہی دونوں کے جسم اندھیرے میں گم ہو گئے ۞

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مَس ہونگے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اِس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ وہ غازہ کا ہلکا سا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضمون ہے یہی شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سرخ و سیاہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہونگے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کوئی ایسے بھی افسوں ہونگے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

دیوندر ستیارتھی

دھرتی کے بیٹے

بچپن کی خوشیاں جن کے نشانات میرے دل پر اب بھی باقی ہیں، ہمارے اس بڑ کے درخت کو بھی یاد ہوں گی۔ کسی دن یہ درخت جوان تھا، اور اس کے جذبات کبھی کسان دولہا کے میٹھے سپنوں سے بھی زیادہ دلکش تھے۔ تب شاید اس کی چھاؤں اتنی گھنی نہ تھی۔ مگر جہاں تک میری یاد کا تعلق ہے میں نے اسے بڑھاپے کے دور سے ہی گزرتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، اس کی ہیئت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اس روز تھی ——— جب میں پہلی بار اس کی چھاؤں میں آ بیٹھا تھا۔

روز بروز، لمحہ بہ لمحہ اس درخت نے راہگیروں کی گفتگو سنی ہے۔ وہ خاموش ہے ضرور، مگر اسے دیہاتی زندگی کے سینکڑوں واقعات کا پتہ ہے۔ سینکڑوں جاڑوں، گرمیوں اور برساتوں کی کہانیاں، امیری غریبی کی کش مکش، ان گنت جھگڑے اور تماشے ——— ان سب نے اس کے سینے پر بے حد لطیف نشانات چھوڑے ہیں۔

اس کے نیچے کا کچا چبوترہ، جو اب نصف سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور جس کے متعلق ٹھنڈی چھاؤں کا مزا لینے والے چرواہے اور کسان نوجوان اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ پہلے بہت خوبصورت تھا۔ یہاں بیٹھ کر بارہا میں نے اس درخت کے کانپتے ہوئے پتّوں کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا تھا۔ کتنی بار تو میں اس کے تنے سے اس طرح لپٹ گیا تھا جیسے اپنے معصوم ہاتھ پھیلا کر میں اپنے باپ کی ٹانگوں سے جا لپٹتا تھا۔

ہمارے گاؤں کی تاریخ کے ساتھ اس بوڑھے بڑ کا یہ اٹوٹ رشتہ کسی خاص تشریح کا محتاج نہیں ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا ایک لطیف جذبہ قائم ہے اور یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ درخت تو ہمارے گاؤں کے چاروں طرف بیسیوں نہیں سینکڑوں ہیں۔ مگر جو اطمینان مجھے اس بوڑھے بڑ کے نیچے بیٹھ کر حاصل ہوتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ بعض اوقات تو میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ وہ گہرا سانس لے رہا ہے اور راہگیروں کی طرف سے نگاہیں پھیر کر میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں ایک ٹھوس سچائی بھری ہے ——— وہی سچائی جو محنت مشقت کے بعد چھاؤں میں بیٹھے ہوئے کسان اور مزدور کو صدیوں سے محسوس ہوتی رہی ہے۔

یہ درخت یہاں نہ ہوتا تو قریب کا یہ نہر کا پُل بالکل بے رونق رہتا۔ نہر سرہند کی یہ شاخ جس پر سیر کرنے کے لئے میں خوشی خوشی چلا آتا ہوں بہت پُرانی نہیں۔ اسے ادھر آئے چالیس سال ہوتے ہونگے۔ جب کھدائی کا کام ہو رہا تھا، مزدوروں اور مزدور عورتوں کی پسینے سے تر پیشانیاں دیکھ کر، اُن کے ہنسی مذاق اور گالی گلوچ کو سُن کر اور اُن کے پوشیدہ جذبات میں انسانیت کا بنیادی احساس پا کر یہ بڑ بہت محظوظ ہوا ہوگا۔ اور پھر جب اس پل کی تعمیر شروع ہوئی ہوگی تو ٹھیکیدار اور سرکاری انجینئر کے درمیان رشوت کا رشتہ دیکھ کر تہذیب اور سرمایہ داری کی اصلیت بھی اُس پر خوب واضح ہو گئی ہوگی۔

"زمین میں جکڑے ہوئے درخت چلنے کی خواہش کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور انسان

ایک ایسی جنت کی آرزو میں سرگرداں ہے جہاں سے تاجدار اور دیوتا بھی رہا ہونے کے لئے بیتاب ہیں! ـــــ بھرتری ہری لکھ گئے ہیں۔ کیا یہ بوڑھا بڑ بھی چلنے کی خواہش کر رہا ہے؟ اتنی اچھی جگہ اسے اور کہاں ملے گی؟

وہ ایک راہگیر جا رہا ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے بے چارے کا جسم کانپ رہا ہے وہ رُک کیوں نہیں جاتا؟ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ کہاں جانا ہے اسے؟ "آجاؤ، بزرگو جی ذرا سستا لو"

میری آواز راہگیر تک نہ پہنچ سکی۔ وہ چلا گیا۔ دور، بہت دور۔ بوڑھا بڑ خاموش کھڑا ہے۔ میں بھی تو سپنوں کے قلعے بنا رہا ہوں۔ چاہتا ہوں، دور اُفق کے پاس جا پہنچوں جہاں سپنوں کی پریاں لوریاں گا رہی ہیں! بوڑھا بڑ خاموش کھڑا ہے۔ شاید وہ کہنا چاہتا ہے "دیکھو کس طرح اپنے بازو پھیلا رکھے ہیں میں نے تیرے اردگرد! کیا میری چھاؤں کی لوریاں سُندر نہیں؟"

جب تک یہ بڑ یہاں کھڑا ہے تب تک آہستہ آہستہ ایک کے کان میں کہتا ہے محبت اور عظمت ایک ہی حسینہ کے دو رخسار ہیں!" میں اسے چھوڑنے کا نہیں۔ ٹکٹکی لگا کر میں اس کی چوٹی کی طرف دیکھتا ہوں۔

درخت کی خاموش محبت میں وہ غلط فہمیاں کہاں جو آدمی کی دُنیا میں قدم قدم پر عیاں ہیں۔

"ٹٹ گئے زنجل دے موتی پیلاں پوندی دے ! ـــــ اوس کے موتی ٹوٹ گئے، جبکہ میں مورنی کی طرح ناچ رہی تھی!

کوئی کسان دوشیزہ گاتی جا رہی ہے۔ اپنے سنہری رتھ پر سوار سورج دیوتا بوڑھے بڑ کے اوپر آگیا ہے۔ چوٹی کے پتے جگ مگ جگ مگ کر اٹھے پنجابی زبان کا یہ سینکڑوں سال سے دِلوں کا سفر کرتا ہوا آرہا ہے "رات نے سورج سے کہا ـــــ تم

چاند کی معرفت پیار کے خط بھیجا کرتے ہو، تمہیں اُن کا جواب اوس کی شکل میں گھاس پر چھوڑ جاتی ہوں!" ——— ٹیگور نے لکھا ہے۔ دیہاتی لڑکی یہ جانتی تو اوس کے موتی یوں اپنے قدموں تلے نہ توڑ دیتی۔

بوڑھا بڑ شاید دھرتی کی اس بیٹی کو پکار پکار کر کہنا چاہتا ہے "تم نے اوس کے موتی کیوں توڑ دیے؟"

یہ لو وہ بچے چلے آ رہے ہیں۔ گھر پر ماں باپ گھڑکیاں دیتے ہیں مگر بوڑھے بڑ کے پاس صرف خاموش محبت ہے، جو اُن کے ذہن میں گڑتی چلی جا رہی ہے۔ سورج کی طرف منہ کیے گا رہے ہیں:-

"سورجا، مورجا!
جھگا دیوں، ٹوپی دیوں،
تیڑ لوں لنگوٹی دیوں
کراری دھوپ کڈھ دے!"

——— اے سورج! میں تمہیں قمیض دوں گا، ٹوپی دوں گا، اور کمر کے لیے لنگوٹی دوں گا۔ تیز دھوپ نکال دو!'

بچوں کی کلکاریاں سن کر بوڑھے بڑ کی خاموشی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ سینکڑوں دن نیچے باری باری یہاں آتے ہیں۔ "چھوٹے بچوں کو میرے پاس آنے دو، بہشت کی حکومت ایسی ہی ہے!" ——— مسیح کا یہ بول میرے ذہن میں گونج اُٹھتا ہے مگر سکول ماسٹر بچوں کو ڈانٹ کر کہتا ہے "سبق کیوں یاد نہیں کیا؟ بوڑھے بڑ کے تلے چھپا نکیں مارنے سے کیا حاصل؟" بچوں کو یہ ہدایت بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ صدیوں سے وہ سورج کے لیے قمیض ٹوپی اور لنگوٹی کی پیشکش لیے حاضر رہے ہیں، شرط یہی ہے کہ وہ جاڑے میں ذرا تیز چمکے اور بچوں کے ارد گرد اپنی گرم کرنوں کا جال تن دے۔

بوڑھا بڑ ایک مست شاعر کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ کسانوں کے نغموں کا وہ پرانا

سرپرست ہے۔ دھرتی کے بیٹوں کی غریبی امیری کا وہ چشم دید گواہ ہے۔ شاید وہ اُن کے دلوں کی باتیں بھی بھانپ لیتا ہے۔

"پپّل گاوے، بوہڑ گاوے،
گاوے ہریالا توت،
کھڑکے سُن راہیا!
تیری روح ہوجوگی سوت!"

——— "پیپل گا رہا ہے، بڑ کا پیڑ گا رہا ہے، سرسبز شہتوت بھی گا رہا ہے۔ کھڑا ہوکر سُن او راہی! تیری روح کو سکون نصیب ہو جائیگا!"

"برچھیاں دے گیت سن کے، میرے دل وِچ چانن ہو گیا!"
——— درختوں کے گیت سن کر میرے دل میں روشنی ہو گئی!

مست ہوائیں، جادو بھری فضائیں، جب بسنت کی دیوی للچائی نگاہوں سے ایک ایک درخت اور پیڑ پودے کی طرف جھومتی، اٹھلاتی چلی آتی ہے، دھرتی کی رگ رگ میں مدھ بھرا سنگیت سما جاتا ہے۔ خود فراموشی کے عالم میں شاید ہر ایک درخت کچھ نہ کچھ گنگناتا ہے۔ پُرسکون لمحوں میں پتّوں کی معمولی سی سرسراہٹ سن کر بھی راہگیر پر اکثر درخت کی دلی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔ درختوں کی صحبت میں، اُن کی حساس سرسراہٹ کے اثر تلے آدمی ہمیشہ دھرتی کے دلی بھید پالیتا ہے۔

نہ تنہا آدمی بھلا، نہ تنہا درخت۔ گاؤں کا شاعر ہمیشہ اپنی رائے دیتا آیا ہے۔ "کلّی ہووے نہ بناں وِچ ٹاہلی، کلّا نہ ہووے پُت جٹ دا!" ——— خدا کرے شیشم کا پیڑ بھی جنگل میں اکیلا نہ ہو اور نہ کسی کسان کا بیٹا اکلوتا ہو!

"بیریاں نوں بیر لگدے، تینوں کی لگدا مٹیارے؟"
——— بیر کے درختوں پر پھل آتا ہے۔ ارے دوشیزہ، تجھے کونسا پھل لگتا ہے؟"
"رُت یاریاں [illegible] دی آئی بیریاں دے بیر پک گئے!"

دھرتی کے بیٹے

—— اب وہ رُت آ گئی جب آپس میں محبتیں پیدا ہو گئیں۔ بیر پک گئے!

"بھنوں کلی نوں چبارا پا دے، روہی والا جنڈ وڈھ کے!"

—— میرے لئے الگ چبارہ بنوا دو، بیابان میں جو جنڈ کا پیڑ کھڑا ہے اسے کاٹ کر شہتیر بنا لیں گے،

"بیہڑے لا تر دیئی چھاویں بہہ کے کتیا کردی!"

—— آنگن میں ایک ساتھ تین درخت اگا آنے دو، ان کی چھاؤں میں میں چرخہ کاتا کروں گی؛

"تھڑیاں وا جھدے سوہندے پپل پھُلاں وا جچہ پھلاہیاں،
ہتاں نال سہیلاں سوہندیاں، بنداں نال گھبرائیاں،
دھن بھاگ میرے! آکھے پپل کڑیاں نے پینگھاں پائیاں۔
ساون وچ کڑیاں نے، پینگھاں اسمان چڑھائیاں!"

—— نہ چبوتروں کے بغیر پیپل سہاونے معلوم ہوتے ہیں نہ پھولوں کے بغیر پھلاہی کے پیڑ۔ ہنس کے ساتھ سہیلی بھلی لگتی ہے۔ اور بند کے ساتھ گھبرائی۔ پیپل کہہ رہا ہے میری خوش قسمتی ہے کہ نوجوان لڑکیوں نے مجھ پر جھولے ڈالے ہیں۔ ساون کے ماہ میں لڑکیوں نے اپنے جھولے آسمان کی طرف بڑھانے شروع کر دیئے ہیں،

"بڑھیا! بڑھیا!! طوطا بولیا
اِکے تیری زمی بھیڑی
اِکے تیرا مَدھ پیا نا!"
"نہ میری زمی بھیڑی
نہ میرا مدھ پیا نا
اِکے کھادا انواب دیاں ڈاچیاں
اِکے شتیر کپ کھڑے نہ کھاناں

ذر
مالت

مرن ترکھاناں دے بچڑے
آون ڈھک ڈھک مکاناں
مرن نواب دیاں ڈاچیاں
تا لے آپوں مرے نواب سیانا"

——"درخت! او درخت!" طوطا بولا "ایک تو تیری زمین خراب ہے (جو تیری پرورش نہیں کرتی) اور تیرا تنا بھی اب پرانا ہو گیا ہے"

"نہ میری زمین خراب ہے، نہ میرا تنا ہی پرانا ہو گیا ہے۔ ایک تو مجھے نواب کی اونٹنیاں کھا گئیں اور پھر ترکھان مجھ سے شہتیر کاٹ لے گئے۔ ترکھانوں کے بچے مر جائیں اور ان کے رشتہ دار افسوس کرنے آیا کریں۔ نواب کی اونٹنیاں مریں اور وہ سیانا نواب خود بھی مر جائے"

دیہاتی گیتوں نے بار بار دھرتی کے باسیوں کو گدگدایا ہے۔

بچے کی طرح میں اس بوڑھے بڑ کی گود میں دوڑا آتا ہوں کھیتوں سے لوٹتے ہوئے کسانوں کے گیت پُراسرار خاموشی کو چیرتے ہوئے مجھ تک پہنچتے ہیں۔

دن بیت جاتا ہے، اور رات اس عورت کی طرح جو اپنے کندھوں پہ بال بکھرائے بیٹھی ہو۔ دھرتی کو اپنے آنچل میں چھپا لیتی ہے۔

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ہمارا یہ بڑ کا درخت، جو میرے بوڑھے دادا کی طرح کمبل اوڑھے کھڑا رہتا ہے، اپنے جذبات میں کھو جاتا ہے اور گھر جانے سے پیشتر میں اس بوڑھے درخت کے تنے سے ایک دو گھڑیوں کے لئے پھر لپٹ جاتا ہوں۔

اپنا من بھاتا پرانا گیت گاتا ہوا میں نہر کا پل پار کر کے گھر کی راہ لیتا ہوں:

"ندی کنارے رُکھڑا کھڑا سی اَمن امان
ڈِگدا ہویا بولیا "جی دے نال جہان"!"

——"ندی کے کنارے درخت امن و امان سے کھڑا تھا۔ گرتا ہوا وہ بولا "جی ہے تو جہان ہے!"

(۳)

وہ سب پھول جو کل رات اپنی بھینی، خوشبو سے لپٹ کر سو گئے تھے۔ اب جاگ اُٹھے ہیں۔ بوڑھے بڑ نے بھی اپنا کالا کمبل اتار پھینکا ہے۔

ایک نہیں، دو چار نہیں، بیسیوں کسان اپنے اپنے بیل لیے نہر کے پل سے گذر رہے ہیں، جلدی، بہت جلدی۔ کوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ کوئی آنکھیں مل رہا ہے۔

"سورج بھگوان کو لاکھ لاکھ نمسکار۔"

"ہاں ہاں سورج کو میرا بھی نمسکار۔ وہ روز چمکتا ہے۔"

"اس بوڑھے بڑ کو بھی میرا نمسکار۔"

"میرا بھی۔"

آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا لطیف جذبہ قائم ہے۔ اور یہ رشتہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ زمین میں جکڑے ہوئے درختوں کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے کبھی تیز رفتار سے، کبھی آہستہ آہستہ ——— آدمی کے لہو کی طرح۔

ہمارے بوڑھے بڑ کی جڑیں دھرتی کی نبض پہچانتی ہیں۔

کتنی لامتناہی ہے زندگی کی وسعت! آدمی اور درخت دونوں دھرتی کے بیٹے ہیں۔

بوڑھا بڑ ایک جہاں دیدہ اور حساس دانا کی طرح کھڑا ہمارے گاؤں کو تکتا ہے

پرسش

بہ خط

اگر ابھی یہ دونوں خط نہ آتے تو میری شرافت بچ جاتی۔ لیکن اب اسے محفوظ رکھنا مشکل
ہے۔ دُنیا کہے گی کہ میں اخلاق سے بیگانہ ہوں۔ مجھے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے
مجھے کیا حق تھا کہ ایک خاندانی لڑکی کے دل سے یوں کھیلوں۔ خیر اگر اتنی حماقت کی بھی
تو اِس بات کو پُرانی ہو لینے دیتا۔ اس کو ابھی سے بیان کر کے میں اپنی ذلالت کا ثبوت
دے رہا ہوں جب میرا درمیانی طبقہ کی چہار دیواری میں نشو و نما پایا ہوا دماغ ٹھکانے
پر ہوتا ہے۔ تب میں بھی ایسے ہی دلائل پیش کرتا ہوں لیکن کبھی بار میرے دماغ میں عجیب
عجیب خیالات اُٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہماری زندگی اتنی چھوٹی ہے کہ اسے ساری عمر
شریف بنے رہ کر ہی گذار دینا عین حماقت ہے۔ اگر مجھے دُنیا سے کچھ سروکار رکھنا ہے
تو ایسے خیالات کو اپنے اندر ہرگز جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ اگر جگہ دوں بھی تو اُن کو قطعی
ظاہر نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے اِس واقعہ کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لینی چاہیئے لیکن

کل بھول جانا چاہیے تھا۔ پر میں اس کو ابھی بیان کر رہا ہوں۔ پچھلے اتوار مجھے
د کا خط ملا تھا ——— روتھ بنرجی کا ——— کل منگلوار گوپال کی چٹھی آئی ہے۔
گوپال لکھتا ہے "بھائی پریتم میں تو لٹ گیا۔ روتھ اب کراچی میں نہیں ہے ہندوستان
میں بھی نہیں۔ اب تم سے چھپانے سے کیا فائدہ میں اُسے "میری اپنی روتھ" بنانا
چاہتا تھا۔ پر کل وہ ایک امیر تاجر کے ساتھ چلی گئی۔ زنجبار کا ایک تاجر اُسے
بیوی بنا کر لے گیا۔ وہ ہوائی جہاز میں جا رہے ہیں۔ یہ کیوں ہوا میری سمجھ سے
بالاتر ہے۔ شاید تمہیں کچھ معلوم ہو۔ تمہارا بھی روتھ کے ہاں کافی آنا جانا تھا میں یہاں
چپکے سے آنسو بہا رہا ہوں۔ تم بھی اپنا سر دھن لو"

گوپال سندھ میں سب جج کے عہدے پر متمکن ہے۔ اپنے قول کے مطابق وہ ایک دن سندھ کے چیف کورٹ کا سب سے بڑا جج بن جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے بمبئی آجانے کے ایک مہینے کے اندر اندر ہی کراچی میں بہت گڑبڑ ہو گئی ہے جس نے ایک سب جج کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ روتھ کا وہ خط مجھے دو دن پہلے مل گیا تھا۔ وہ کہتی ہے "مجھے معلوم ہے تم خط لکھنا پسند نہیں کرتے۔ پر تمہیں خط پڑھنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔ تم کہا کرتے ہو کہ خط صرف بیوقوف ہی لکھا کرتے ہیں۔ کیونکہ خط عام طور پر ادھر اُدھر کی بہکی بہکی باتوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ تو مجھے بیوقوف ہی سمجھ لینا۔ اس خط کو میرے طفلانہ دماغ کی بہکی ہوئی باتوں کا مجموعہ ہی سمجھ لینا۔ ایسے خطوں کو دوبارہ پڑھنے کی تمہیں ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں تمہاری زندگی میں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو رہی ہوں۔ میں یہاں سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ جہاں مجھے تمہاری یاد بھی نہ آئے۔ زندگی میں میں نے سایہ کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ تمہاری لاپرواہی نے میرا علاج کر دیا ہے۔ تمہیں مجھے بھولنے کی کوشش نہ کرنی ہو گی۔ بھلائی وہی چیز جا سکتی ہے۔ جو یاد ہو۔ اور میں تمہیں یاد نہ تھی کبھی نہ تھی"

پر یہ سچ نہیں ہے۔ مجھے روتھ یاد ہے اور کافی عرصے تک یاد رہے گی۔ لیکن ہاں

یہ خط

جن معنوں میں وہ تمنا کر رہی ہے کہ میں اُس کو یاد رکھوں ویسا نہیں ہو سکا کا عذر نہیں
معلوم ہوتا ہے کہ تمام معاملے کا گناہ میرے سر پہ ہی ہے۔ پر ایسا کیوں ہے۔ میں کیسے مطابق
بتا سکتا۔ نہ کبھی

روتھ کا باپ بنگالی تھا۔ اُس کی ماں ہنگری کی عورت ہے۔ روتھ کے چہرے اور
دماغ دونوں میں مشرق اور مغرب کا پورا ملاپ ہے۔ اُس کا رنگ چڑھتے ہوئے سورج
کی طرح کھلا ہوا ہے اور اُس کے نقش ایسے صاف اور تراشے ہوئے ہیں جیسے کہ ایک
خوبصورت بت کے۔ اُس کی آنکھیں مشرقی ہیں۔ اُن میں وہی یاس اور کشش ہے
جو صرف ایک ہندوستانی نازنین کی آنکھوں میں ہی ہو سکتی ہے۔ اور خاص کر ایک
بنگالی نازنین کی آنکھوں میں۔ اُس کے بال ملائم ہیں۔ چمکدار ہیں۔ جسم گداز ہے۔ اور
جیسا اُس کا جسم غیر معمولی ہے ویسا ہی اُس کا دماغ بھی۔ اُس میں تخیل اور سمجھ ہے۔
پر مشرق کا الہڑپن نہیں۔ نزاکت اور ادا ہے پر اس پر مغرب کی تربیت اور پالش ہے
سچ تو یہ ہے کہ اُس میں وہ سب کچھ ہے جو ایک دوشیزہ کو آدمی کے چاہنے کی چیز بنا سکتا
ہے۔ پھر بھی میں اُس سے محبت کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ اُسے ایک
خط لکھ دوں۔ اُس میں کہوں "میڈم میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ پر مجھے افسوس ہے
کہ تمہارے دل میں میرے لئے جو جذبات ہیں۔ میں اُنہیں اپنانے سے معذور ہوں تم اپنے
بڑے دماغ کو اپنی مخصوص خاصیت سمجھتی ہو۔ میرے نزدیک وہی تمہاری سب سے بڑی کمزوری
ہے۔ بدقسمتی سے میرا اپنا دماغ ایک بڑا ذہین دماغ ہے۔ اِس کے لئے میں ذمہ دار نہیں ہوں
کئی بار تو میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر میں بھی کند مغز، خر دماغ اور احمق ہوتا تو اپنی موجودہ حالت
سے کہیں زیادہ خوش رہتا۔ تم کہتی ہو تم نے مجھے ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا ہے۔ میں یہ قبول
کرتا ہوں۔ پر یہ مسکراہٹ تو ایک پردہ ہے۔ جو دل کے زخموں کو ڈھکنے کا کام دیتا ہے
اُن کو آرام دینے کا نہیں۔ میڈیم میں اپنی مسکراہٹ کا شکار آپ ہی ہوں جیسے تمہاری
قابلیت میرے نزدیک تمہاری کمزوری ہے۔ تم بھول جاتی ہو کہ جب آدمی عورت کے حسن

سماں کا معیار قائم کرتا ہے تو اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ عورتوں کی
درشتی تو ماپنے والے کے دل کے ولولوں کا صرف عکس ہے۔ خارجی خوبصورتی
اُسے خاص چیز نہیں۔ تمہارے پاس دولت ہے۔ حُسن ہے۔ اور ایک اعلیٰ دماغ ہے۔ تم
جس سوسائٹی میں چلی جاؤ گی، تمہارے مداح تمہارے چاروں طرف گھومیں گے۔ تم
جس نقطہ کو لیتی ہو اُس پر بڑی ذہانت اور ذکاوت سے بحث کر سکتی ہو۔ تمہارے دماغ
کی ذہانت دیکھ دیکھ کر کلب کے نوجوانوں کا دل ہوا میں ہلتے ہوئے پتوں کی طرح ڈولے گا
اور اُن کے جسم میں ریشمی کپڑے کی سرسراہٹ کی طرح سنسنی پیدا کرے گا۔ پر میڈم تمہیں
نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میرے ہاتھوں کے ناخنوں میں اتنی قابلیت ہے جتنی سبھی کلبوں
کے سبھی نوجوانوں کے دماغوں کو ملا کر بھی نہیں بنتی۔ اور میں اِن کلبوں میں نہیں جاتا۔ تم
جانتی ہو خدا نے مجھے دماغ بخشا ہے۔ مجھے بھی یہ معلوم ہے۔ تو پھر میں اپنے آپ کو اُن
بیوقوف نوجوانوں کی کلبوں سے کیوں نہ پرے رکھوں۔ میں اُن سب کو بڑی حقارت
سے دیکھتا ہوں۔ یہ میری خود پسندی ہے نہ۔ ہو کیوں نہ۔ تمہیں ایشور نے حُسن دیا ہے
تم اِس کا غرور کرتی ہو۔ اِس کو ہمیشہ بڑھانے کا، قائم رکھنے کا خاص دھیان رکھتی ہو
میرا حسن میرا دماغ ہے۔ میں صرف اُنہیں آدمیوں سے مل کر خوش ہوتا ہوں جن میں کچھ
ذہانت ہے، یا جو مجھ سے زیادہ عالم ہوں۔ تم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھو کہ میں ہفتہ
میں دو بار تمہارے گھر آتا رہا ہوں۔ مجھے تم سے باتیں کرنے میں مزا آتا ہے۔ پر اِس
بھول میں نہ رہنا کہ یہ تمہارا بہار میں کھلتے ہوئے پھول کی طرح کا حُسن تھا جو مجھے تمہارے
پاس کھینچ لایا کرتا تھا۔ مجھے تمہارے جسم کی خواہش نہیں ہے۔ میرے لئے تمہاری کشش
دماغی ہے، جسمانی نہیں۔ میں تو بہت دُور دُور گھوم آیا ہوں۔ میں بہت حسین دوشیزاؤں
سے ملا ہوں۔ اُن میں سے کئی ایک تم سے بھی زیادہ خوبصورت تھیں۔ پر اُن میں ایک
بات ہوتی تھی۔ جو تم میں نہیں ہے۔ اُن کا جسم شگفتہ پھول کی طرح تازہ اور کھلا ہوا
ہوتا تھا۔ پر اُن کے کندھوں پر ایک فلسفیانہ دماغ کا بوجھ نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی مجھ کو

چاہ ہوتی تھی۔ اگر وہ اپنے آپ کو میرے حوالے کرنا چاہتی تھیں تو مجھے کسی قسم کا عذر نہیں
ہو سکتا تھا۔ میں نے تمہیں کہا ہے نہ کہ سب کا اپنا اپنا معیار ہوتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق
تمہاری بیوی وہ عورت ہے جو نہایت سادہ لوح اور بے وقوف ہو۔ لیکن جس میں کبھی
کبھی جوہر کی تجلی چمک جاتی ہو۔ میں مزدور کی طرح اپنے ہاتھ سے محنت
نہیں کرتا۔ ایسا کام کرنے والوں کی نفسانی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اُنہیں عورت
چاہیئے۔ کوئی عورت۔ لیکن میرا سب کام دماغی ہے۔ میں ایسے معاملوں میں بڑی تمیز سے
کام کرنے والا ہوں۔ جب میں کچھ لکھ کر تھک جاتا ہوں تو میرے دماغ کو راحت چاہیئے
مجھے ایسی عورت چاہیئے جو میرے سر کو اپنی گود میں رکھ کر اپنے نازک ہاتھوں سے
آہستہ آہستہ میری کنپٹیوں کو سہلائے۔ اور بے معنی۔ بہت ہی بے معنی پیار کی باتیں
گنگنائے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم اس امتحان میں پوری نہ اترو گی۔ تمہارے اور میرے
درمیان ایک خلیج حائل ہے جس کو عبور کرنا میرے لئے بہت دشوار ہے۔ تمہارے ہاتھ
نازک ہیں لیکن اُن میں وہ کوملتا نہیں ہو سکتی ہے جو ایک سادہ لوح الھڑ لڑکی کے
ہاتھوں میں ہو گی۔ تمہاری باتیں میٹھی ہیں۔ پر وہ سب بہت مصنوعی لگیں گی تمہیں بھی
مجھے بھی۔ جب دماغ کی دماغ سے ٹکر ہوتی ہے تب لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔
پر ذہن جسمانی خواہشوں پر ٹھنڈے پانی کی مانند ہے۔ تمہاری باتیں۔ تمہاری پیار کی
باتیں بھی ادبی اور فنی پیرایہ میں ہوں گی۔ میری جسمانی خواہشوں کو بالکل بیکار کر دیں
گی۔ اور میں ابھی اِن خواہشوں کو ترک نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے ہی دماغی کام کرنے والوں
کی نفسانی حس بہت حد تک ادب کی نذر ہو چکی ہوتی ہے۔ اُن کے دل میں جس عورت کو
وہ دیکھیں اُسی کو بیوی بنانے کی خواہش ہر موقع پر نہیں ہوتی۔ اور اگر اس بچی کھچی خواہش
کو بھی دماغی مصروفیت کی وجہ سے مار دیا گیا تو بس غریب ادیب کا خدا حافظ ہے۔ تم یقین
جانو کہ تمہاری ملاقات کے پہلے دو موقعوں کے سوائے مجھے کبھی تمہارے جسم کو برہنہ دیکھنے
کی ذرا بھی خواہش نہیں ہوئی۔ پہلے دو موقعے مختلف تھے۔ اُن میں میں صرف تمہاری باتیں

ہی دیکھ پایا تھا۔ تمہاری پیاس بھری آنکھیں۔ تمہارا سمندر پہ پڑتی ہوئی چاندنی کی طرح نکھرا
ہوا رنگ۔ تمہاری نازک مسکراہٹ۔ تمہاری ابھری ہوئی چھاتیاں۔ اگر تم ان دنوں موقعوں
پر چپ رہتیں ——— یا خدا تم کیوں نہ چپ رہیں ——— تو تمہارے لئے میری تمنا
برقرار رہتی۔ تمہیں یاد ہے نہ وہ پہلا موقعہ جب میں پہلی بار تمہیں ملا تھا۔ کراچی میوزک
سرکل کی مینیجنگ کمیٹی کی افتتاحی میٹنگ تھی۔ داتمودر سے تم واقف تھیں۔ وہ تمہیں بھی
ساتھ لے آیا تھا۔ وہ تمہارا بڑا مداح ہے تمہارا ذکر کرتے وقت اس کی آنکھوں میں ایک
نشہ سا چھا جاتا ہے۔ وہ پہلے بھی کئی بار تمہارا ذکر کر چکا تھا مگر سچ جانو تو مجھے خیال بھی
نہیں آسکتا تھا کہ تم اتنی خوبصورت ہوگی۔ تم شاید اب اس بات کے اقرار سے ہنسو
کہ تمہاری خوبصورتی کے گوپال اور میں دونوں ہی شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ تم کہتی ہو کہ اس
دن میں نے اپنی باتوں سے تمہیں بہت متاثر کیا تھا۔ میری باتوں کا پالش۔ ان کو
کہنے کا مخصوص لہجہ اور میرے خیالات کی نزاکت کو دیکھ کر تم نے سمجھا تھا کہ میں ایک بہت
بڑے اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ تم مجھے پھر ملنا پسند کروگی۔ پر تمہیں معلوم نہیں
کہ میں باتیں کرتا ہوا کتنا (SELFCONSCIOUS) محسوس کر رہا تھا۔ مجھے پکا یقین
ہے کہ میری ہر ایک بات اس انداز سے کہی جا رہی تھی کہ تم پر اس کا پورا پورا اثر پڑے
خوبصورت عورت کے سامنے میری خوش گفتاری کی ندی طغیانی میں آکر دریا ہو جایا کرتی
ہے۔ تمہارے داہنے طرف بیٹھا ہوا تمہارا بھائی بار بار میری نظر کا پیچھا کر کے مجھے عجیب
پریشان کر رہا تھا۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ میں نے اپنی باتوں سے تمہیں اپنا گرویدہ کر لیا ہے
مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی دن سے تمہاری عقل پر میری محبت کا پردہ پڑنے لگا
تھا جس کی وجہ سے میری ہر ایک حرکت ہر ایک بات تمہیں قوس قزح کی طرح رنگین
اور آبشار کی موسیقی کی طرح قدرتی معلوم ہوتی تھی۔ تمہیں تو میری کسی بات کا یقین نہیں
آتا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں کبھی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ کہ میری ہر ایک بات طنز سے
بھری ہوتی ہے۔ پر میں تم کو کس طرح یقین دلاؤں کہ اس پہلے دن میں تخیل میں اپنا

سر دھن رہا تھا۔ چھ مہینوں کی لگاتار کوشش کے بعد میں اِس میوزک سرکل کو شروع کر سکا
تھا۔ کراچی جیسی جگہ میں کسی بھی آرٹ کی چیز کو کامیاب بنانا کوئی سہل بات نہیں ہے۔ کراچی
کی زمین بنجر اور ریگستانی ہے۔ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں بھی یہ ریگستان چھا گیا ہے
مجھے جتنے کراچی کے لوگ فن اور ادب سے بے بہرہ معلوم ہوئے۔ اتنے اور کسی جگہ کے
نہیں۔ تم تو ریگستان میں ایک نخلستان ہو۔ اتنی کوششوں کے بعد میں میوزک سرکل کی
افتتاحی رسم ادا کر رہا تھا۔ اور پہلے ہی دن تم آوارد ہوئیں۔ تم خود سنگیت کی طرح تھیں۔
مجھے ڈر لگنے لگا کہ اگر اب تم میوزک سرکل میں نہ رہیں تو میری سب امیدوں پہ پانی پھر جائیگا۔
اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی ذہین ہوگی۔ مجھے صاف دکھائی دینے لگا کہ اب
جب تک تم میری نہ ہو جاؤ گی میرے آنے والے سبھی دن تمہیں فتح کرنے میں صرف
ہونگے۔ اُس وقت میرا خیال تھا کہ تم بھی بہت سادہ اور بھولی ہوگی۔ میوزک کی طرح
بے معنی پہ میوزک کی طرح ہی دل کو ہلا دینے والی تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں خود اعتماد
بھی بہت ہوں اور خود پسند بھی بہت۔ تب میں یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ تم میرے اتنے
نزدیک آؤ اور میری مداح نہ ہو کر رہو۔ پر اس تخیل کی صحرا نوردی میں مجھے اپنے میوزک
سرکل کا مستقبل بہت دھندلا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں دونوں میں سے ایک ہی کام
کو تندہی سے کر سکتا تھا، تمہارے پیچھے سرگرداں پھرنا یا میوزک سرکل کو کامیاب بنانا۔ مجھے
کیا معلوم تھا کہ تمہاری دو تین ملاقاتوں ہی کے بعد تمہارا اور میرا رشتہ دماغی دوستی ہو کر
رہ جائیگا۔ خیر۔

اِس پہلی ملاقات کے بعد قریباً ایک مہینے تک مجھے تم سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا
میں ایسے معاملوں میں بہت شرمیلا ہوں۔ ہاں اگر یہ کہیں مجھے معلوم ہو جاتا کہ تم اِس
طرح مجھ سے متاثر ہوئی ہو تو میں کبھی کا حوصلہ کر کے تمہیں ملنے آگیا ہوتا۔ یہ بھی قسمت ہی
سمجھو کہ میں تمہیں دوسری بار دیکھ پایا۔ تمہیں ملنے کی چاہ تھی۔ لیکن میں اپنی چاہت کا
ڈھنڈورا نہیں پیٹا کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر یہ دوسرا موقعہ ہاتھ نہ آتا تو میں شاید پھر کبھی

تمہیں مل ہی نہ سکتا تھا۔ تمہاری خوبصورتی کے تخیل سے سرشار رہ کر ہی کئی سال گذار دیتا۔ اُس کے بعد میں تمہیں بھول جاتا؟ دنیا میں کوئی ایسی سکھ دُکھ کی چیز نہیں ہے جس کو اُسی جذبے اور احساس سے تاعمر یاد رکھا جاسکے۔ اور یہ موقعہ اس طرح پیش آیا کہ اپنے ایک دوست نرائن کے ہاں ایک بجے میری دعوت تھی۔ راستے میں واتمودر کا گھر پڑتا ہے میں نے سوچا چلو اس کا گلہ بھی اتارتا چلوں۔ بہت دنوں سے اس کو نہیں مل سکا تھا۔ اُس کے ساتھ باتوں باتوں میں ہی مجھے پتہ چلا کہ وہ تمہیں تین بجے ملنے کے لئے جائے گا۔ میں نے اپنے دل کے راز کو چھپاتے ہوئے کہا کہ اگر یہ کوئی پرائیویٹ میٹنگ نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلا چلوں، ہمیں بنرجی سے میوزک سرکل کی مینیجنگ کمیٹی کا ممبر بننے کے لئے درخواست کرنی ہے۔ واتمودر نے کوئی حیل و حجت نہیں کی۔ بے چارا بڑا اچھا آدمی ہے اور میں بھی تمہیں تین بجے ملنے چلا آیا۔ باقی تمہیں معلوم ہی ہے۔ تین بجے آیا تھا۔ چار بج گئے۔ ساڑھے پانچ بج گئے۔ تب کہیں رخصت لینے کی نوبت آئی۔ اڑھائی گھنٹے۔ دوسری ملاقات میں ہی تم مجھ سے اڑھائی گھنٹے باتیں کرتی رہیں۔ تمہاری واتمودر سے بہت باتیں نہ ہو سکیں۔ وہ بھی اپنے دل میں حیران ہو رہا ہوگا۔ اور جاتے جاتے تم نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا (تمہیں ہاتھ ملاتے ہوئے کیا سوجھتی ہے۔ جو باتیں کئے جاتی ہو۔ اور تمہارا ہاتھ ویسے ہی میرے ہاتھ میں پڑا رہتا ہے) کہ اگر مجھے کوئی عذر نہ ہو ——

آہ مجھے عذر! تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اس وقت میں اپنی تہذیب اور اعلیٰ پرورش کی مدد سے بمشکل تمام ایسا دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ گویا تمہارے کہنے کا مجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا ہے —— تو اگلے جمعہ کے دن تمہارے ہاں چائے پینے آؤں۔ اور تب (میرا ہاتھ ویسے ہی پکڑے ہوئے تمہیں بھول گیا کہ یہ ہماری صرف دوسری ملاقات ہے اور تمہاری ہائیڈل برگ میں سیکھی ہوئی تمام تہذیب دھوئیں میں کافور ہوئی جارہی ہے) تم نے واتمودر سے کہا "تم بھی چلے آنا"

معاف کرنا، یہ تمہاری زیادتی تھی۔ واتمودر تمہاری محبت کا دم بھرتا ہو یا نہ بھرتا ہو

(بیچارا بڑا بھلا آدمی ہے) پر گوپال تم پر لٹو تھا اور ہے۔ اُس کو تم نے چاہئے پر کیوں نہ بلایا۔ اب جب میں اُن پچھلی باتوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں گوپال کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے تھی۔ مجھے وہ ہمیشہ کند ذہنی کی زندہ مثال معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی کمی اُس کی کم دماغی ہے۔ اِس لئے اُس کی خواہش ہمیشہ ذہین حسینوں کا آنچل پکڑنے کی رہی ہے ——— تم نے اُس کو اتنی بار دھتکارا ہے کہ اور کوئی ہوتا تو کبھی کا تم سے کنارہ کش ہو گیا ہوتا ——— کاش تم نے مجھے کبھی نہ دھتکارا۔ ایک بار بھی مجھے دروازہ دکھا کر کہتیں "اپنا راستہ پکڑو" تو میری زندگی کی ایک بڑی بھاری خواہش پوری ہو جاتی مجھے بھی معلوم ہو جاتا کہ نازنینوں کے کوچہ سے بدنام ہو کر نکلنا کیسے کہتے ہیں میری بدقسمتی ہی سمجھو کہ ابھی تک کسی دوشیزہ نے مجھے آنکھ بھوئیں تان کر نہیں دیکھا ———

پر گوپال اب بھی تمہارے نام ہی کی مالا جپتا ہے۔ اُسے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ تم اُس سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔ اُسے پتہ بھی کیسے چلے۔ اُس کو سخت سست بھی کہتی ہو اور وقت آنے پر اُس کے تحفے بھی قبول کر لیتی ہو۔ اور کیسے تحفے! اُس کے گاؤں سے بھیجے ہوئے ایک من چاول! کتنا غیر رومانی تحفہ! اور پھر تم مجھ سے پوچھتی ہو کہ "کیسے انکار کرتی؟ وہ اتنا زور دے رہا تھا" میں شروع سے ہی تم سے صاف صاف بغیر کسی جھجک کے سب باتیں کر دیا کرتا ہوں۔ اِسی لئے کہتا ہوں کہ تم میں روحانی طاقت بہت کم ہے۔ گوپال کو ایسے ہی اپنے پیچھے لٹکائے گھوم رہی ہو۔ شاید یہ بھی عورت کا اپنی خود پسندی کو خوش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ مجھے یہ تو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ تمہارے پاس اُس کے لئے نفرت کے سوائے کچھ نہیں ہے لیکن وہ کتنا ہی نفرت کے قابل کیوں نہ ہو تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنے ایک پروانے کو اپنے قابو سے جانے دو۔ پر تم اُسے ذلیل بہت کرتی ہو۔ بھلا مجھے وہ سب باتیں بتانے کی کیا ضرورت تھی جو گوپال کی تمہارے ساتھ ہوا کرتی ہیں کبھی کبھی تو میں سوچا کرتا ہوں کہ تم اِس معاملے میں اپنی اونچے درجے کے طبقے کی نشو و نما کو بھول جاتی ہو۔ پر شاید یہ

بھی ایک طریقہ ہو جس سے تم مجھے جتانا چاہتی ہو کہ تمہاری زندگی میں صرف میں ہی تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل ہوں۔ اُس دن جو تم نے مجھ کو باتیں بتائیں وہ تو واقعی بہت دلچسپ تھیں باتوں باتوں میں ہی گوپال (آہ! اُس کی بیوقوفی) تم سے کہنے لگا
"روتھ"
"دیکھو مسٹر کھنہ" تم نے اُسے جواب دیا۔ "تمہیں شرم آنی چاہئے۔ مجھے میرے پہلے نام سے نام سے مخاطب کرتے ہوئے میں مس بنرجی ہوں۔ مجھے برائے مہربانی مس بنرجی رہنے دیجئے۔"
"پر میں اگر تمہیں روتھ کہہ کر پکاروں تو تم مجھے کیونکر روک سکتی ہو۔ مجھے روتھ کہنا اچھا لگتا ہے میں تو روتھ ہی کہوں گا۔"
تمہیں غصہ تو بہت آیا پر تم چپ رہیں۔ اگر آدمی اپنی تہذیب گنوا بیٹھے تو ایک شریف زادی کو تو کم از کم اپنے آپ کو نہیں بھولنا چاہئے۔ تمہیں اپنے جذبات پہ قابو ہے۔
"روتھ، میں نے سوچا ہے کہ ہر مہینے تمہیں اپنی ساری تنخواہ لاکر دے دیا کروں پھر جو تم چاہو مجھے خرچ کے لئے دینا۔ باقی تمہارے پاس رہے۔"
(گوپال بالکل ہی اُلو ہے۔ اُسے کسی دوشیزہ سے دل لگانا بھی نہیں آتا۔ شاید تم اُس کی زندگی میں پہلی اور آخری محبوبہ ہو)
"تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، مسٹر کھنہ۔ کیا بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔"
"واہ اِس میں بہکنے کی کیا بات ہے میں تمہیں اپنے گھر کی واحد مالکہ بنانا چاہتا ہوں۔"
تمہارے پاس اس کا کیا جواب تھا۔ سوائے اِس کے کہ اُس کی بیوقوفی پر مسکرا دیتیں۔
یہ مسکرانا خطرناک ثابت ہوا۔
"روتھ، کیا میں تمہیں چوم سکتا ہوں۔ تمہارے منہ کے اُس بائیں کونے کو جہاں تمہارے لبوں کا کنارہ خمیدہ ہے۔

گوپال بھی کبھی کبھی فنی نکتوں کو دیکھ لیا کرتا ہے۔

تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا تم نے اس بات کو مذاق بنانا چاہا۔

"کوئی دیکھ لے گا"

"تو روتھ! اندر چلیں آج مجھے تمہارے لبوں کو چومنے کی بہت خواہش ہے تم میرے دل کی رانی ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے"

یہ وقت تھا گوپال کو دروازہ دکھانے کا۔ پر تم شرافت کی پتلی بنی رہیں صرف اتنا کہا۔

"مسٹر کھنہ! تم اپنے کو بھول رہے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اب ایک اور جگہ ملنے جانا ہے نمستے"

اور تم اٹھ کر چلی گئیں۔ اگر اُسے اس وقت دروازہ دکھا دیا ہوتا تو وہ شاید سمجھ جاتا۔ وہ موٹی عقل کا آدمی ہے۔ ابھی تک نہیں سمجھا۔ اب بھی تمہیں روتھ کہتا ہے۔ اب بھی تمہارے گھر آتا ہے۔ اب بھی تمہیں تحفے بھیجتا ہے۔ اب بھی یہ سمجھتا ہے کہ تمہارے دل میں اُس کے لئے بہت لحاظ ہے۔

پر مجھے یہ تو بتاؤ کہ جب گوپال ہفتہ میں سات بار تمہیں ملنے آتا ہے۔ تو کچھ دن تم کیسے گھر پر رہتے ہوئے بھی اُس کو کہلوا بھیجتی ہو کہ میم صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ اور میں چاہے کسی وقت آدھمکوں، تم کو ہمیشہ گھر پر ہی پاتا ہوں۔ جیسے پہلے میرے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھیں۔

جب تم نے مجھ سے گوپال کے ساتھ اس گفتگو کا ذکر کیا تو مجھے پہلی بار خیال آیا کہ میں بھی تمہیں مس بنرجی کی بجائے مس روتھ ہی کہتا آیا ہوں۔ اگلے دن میں نے تم سے معافی مانگی کہ میں غلطی سے تمہارا پہلا نام لے کر پکارتا رہا ہوں۔ آئندہ زیادہ محتاط رہوں گا۔ تم یہ سن کر بہت خفا ہوئیں۔ تم نے کہا "میں تم سے بہت ناراض ہوں۔ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میرا اصلی نام لیکر نہ پکارا کرو۔ آگے ہی کب میرا اصلی نام لیتے ہو تمہیں یہ ونقد

کہتے ہوئے پتہ نہیں کیوں ڈر لگتا ہے میرا خیال تھا کہ ہم اب ایک دوسرے کو کافی جاننے لگے ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے کا اصلی نام لے کر پکار سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "پر گوپال بھی تو تمہیں اچھی طرح سے جانتا ہے۔"

"خاک جانتا ہے" تم نے کہا "اگر جانتا ہوتا تو کبھی کا اشارہ سمجھ گیا ہوتا۔ اور بار بار آکر مجھے پریشان نہ کرتا۔"

بے چارا گوپال! مجھے پتہ نہیں تم اس بے چارے سے کیوں چڑتی ہو۔ سچ پوچھو تو میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ تم کسی گوپال جیسے موٹی عقل والے آدمی کے ساتھ ہی سکھی رہ سکو گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ کتنے مغرور ایسے ذہین عورتوں پر بہت مرتے ہیں۔ اگر خدا کی ان پر مہربانی ہو جائے اور ان کو ایسی بیوی مل جائے تو وہ ہمیشہ اس کی خاطرداری میں محو رہتے ہیں۔ اور اگر وہ بیوی خوبصورت بھی ہو (جیسی کہ تم ہو) تو تم اپنے خاوند کو دائمی غلام سمجھ سکتی ہو۔ ذہین آدمی بھی کبھی بار ذہین عورتوں کو بیوی بنانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ پر یہ تمنا تب تک ہی دل میں ٹھہرتی ہے جب تک کہ ان کا کسی ایسی عورت سے پالا نہ پڑے۔ یقین جانو کہ جب بھی کوئی ادیب یا آرٹسٹ کسی ذہین عورت کا خواہشمند ہے یا اس کو معیاری سمجھتا ہے۔ تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ عورتوں کی ہستی ابھی تک اس کے تخیل تک ہی محدود ہے۔ اصلیت کے پہلے دھکے سے ہی تمام رومانی دنیا ریت کے مکان کی طرح ڈھیر ہو جاتی ہے۔ پر اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لینا کہ دماغی آدمیوں کو ہمیشہ بیوقوف عورتوں کی ہی صحبت پسند ہے۔ ذہین عورت سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنی بیوی نہ ہو۔ اصل میں تو بیوی تھکے ہوئے دماغ کے لئے راحت کا ذریعہ ہے۔ تم جانتی ہی ہو میں گھر میں زیادہ عرصہ نہیں رہتا۔ روزی کمانا بڑا مشکل کام ہے صبح دس بجے سے لیکر شام کے چھ بجے تک دفتر میں کاغذوں پر جھکے رہنا پڑتا ہے۔ شام کو دفتر سے نکلتے نکلتے دماغ ایسے ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی نے خربوزے میں سے سارا گودا نکال لیا ہو۔ ادھر باہر اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ ادھر پہلے ہی دل و دماغ پر

تھکاوٹ کی مردنی چھا جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر تم ہی خیال کرو، میں کیسے تمہاری
فلسفیانہ باتیں سن سکتا ہوں۔ کیسے تم سے سیاسی اور فنی معاملات پر بحث کر سکتا ہوں
اُس وقت تو ایسی دوشیزہ کی خواہش ہوتی ہے جس کے پاس سوائے حسن اور بے معنی
باتوں کے اور کچھ نہ ہو۔ تمہیں معلوم نہیں ہے تھکے ہوئے دماغ کے لئے بے معنی باتیں
کتنی پُر معنی ہوتی ہیں۔ ذرا سوچو تو سخت چٹان پر گرتے ہوئے آبشار کے پانی کی موسیقی
بارش کی بوندوں کی گھاس پر پڑنے کی آواز، کسی کا ترنم خیز سنگیت، کتنی بے معنی
چیزیں ہیں۔ ان سے نہ تو کبھی کسی کا پیٹ بھرا ہے۔ نہ کسی کی جیب، پر یہی چیزیں ہیں
جو تھکے ہوؤں کو راحت بخشتی ہیں۔ سوئے ہوئے دل کے تاروں کو جھنکارتی ہیں۔ ایسے
موقعہ پر فلسفہ پر بحث و مباحثہ کرنا زندہ درگور ہو جانے کے برابر ہے۔ اُس وقت تو
ایک نہایت خوبصورت اور نہایت بے وقوف عورت چاہیئے جو میرے سر کو آغوش
میں لے لے۔ آہستہ آہستہ میرے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں پھیرے۔ اور دھیرے
دھیرے کچھ محبت کے الفاظ کہے، کچھ پریم کے نغمے گنگنائے، کچھ اِدھر اُدھر کی ایسی ہی
بے معنی باتیں کرے۔ کرتی رہے۔ جب تک کہ میں اسی بہشت سے لطف اندوز ہوتا
ہوا اونگھ نہ جاؤں۔ تمہیں سوچو تم کبھی ایسی باتیں کر سکو گی؟ تمہارا وجود تو اُس وقت ضروری
ہوتا ہے جب دماغ تازہ ہو۔ جب یہ خیال ہو کہ دنیا کی بھلائی بُرائی۔ ترقی و پستی، تہذیب
تمدن کا دارومدار ہماری گفتگو اور بحث پر ہی منحصر ہے۔ جب یہ خیال ہو کہ ہر وہ لفظ
جو ہمارے ہونٹوں سے نکل رہا ہے۔ فن اور ادب کے محل کی ایک پختہ اینٹ ہے لیکن
اپنی ساری زندگی ایسی باتوں میں ہی صرف کر دینا میرے خیال میں سخت حماقت ہے
لیکن ہاں چونکہ تم زیادہ وقت یونہی بیٹھے بیٹھے گذارتا ہو یعنی جو بے معنی چیزوں سے
سیر ہو چکے ہوں ان کے لئے تمہارے جیسی ہستیوں کا وجود اس دنیا میں خدائی ہے
ایسے لوگ تمہارے جسم کی خواہش رکھیں گے تمہارے دماغ سے مرعوب ہوں گے۔
بدقسمتی سے مجھے تمہاری خوبصورتی کے باوجود میرے لئے تمہارے جسم کی اب کوئی کشش

باقی نہیں رہ گئی۔ صرف پہلے دو تین موقعوں پر ہی کشش تھی۔ تمہارے دماغ کا میں اب بھی قائل ہوں۔ جہاں تک دماغوں کا تعلق ہے سمجھ لو ہماری بہت دیر سے شادی ہو چکی ہے بس آدمی اور عورت کے اسی دماغی بندھن کا دوسرا نام پلیٹونک لو (PLATONIC LOVE) یا افلاطونی محبت ہے۔ تم نے تو ہائیڈل برگ (HEIDEL BERG) میں تعلیم پائی ہے۔ یونان کے فلسفہ اور علم سے تم بے بہرہ نہیں۔ پلیٹو (PLATO) نے لکھا ہے کہ آدمی اور عورت کے درمیان بغیر کسی قسم کی جسمانی خلیج حائل ہوتے ہوئے بھی رشتہ ہونا ناممکن ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان بھی اب وہی رشتہ قائم ہو رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ رشتہ ہمیشہ جسمانی کشش سے شروع ہوتا ہے۔ اگر تم اتنی خوبصورت نہ ہوتیں، اگر تمہاری آنکھوں میں یہ للچا دینے والی موہنی نہ ہوتی تو میں اس دماغی رشتہ سے محروم رہ جاتا تم سے دوسری بار بات کرنے کی بھی خواہش نہ ہوتی۔ کراچی میں اور بھی ہزاروں لڑکیاں ہیں جن کی طرف میں نے کبھی جی بھر کر دیکھنے کی خواہش بھی محسوس نہیں کی۔ اُن سے میرا دماغی رشتہ کیا قائم ہوگا۔ پر ہاں جب میں اس طرح تمہارے نزدیک کھنچنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا جسم ہی تمہارا واحد ہنر نہیں ہے۔ تمہارا دماغ تمہارے جسم سے بھی زیادہ خوبصورت ہے اگر تمہارے دماغ کی خوبصورتی تمہارے جسم کی خوبصورتی سے مماثلت کرتی۔ تب بھی شاید میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتا کیونکہ تب تم یہ کبھی نہ بھول سکتیں کہ تم بہت خوبصورت ہو اور کہ اس خوبصورتی کو قائم رکھنے کے لئے تم میں اُس خود نمائی ہی کی (VANITY) کی ضرورت ہے۔ جو عورت پن کو قائم رکھنے کا ذریعہ لئے از حد ضروری ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو تم بھی کتنی بار اپنے علم۔ اپنے مشکل کام ہے آرٹ کو بھول کر خود ایک آرٹ، ایک آدمی کے چاہنے کی چیز بن جایا رہنا پڑتا ہے۔ ان باتوں سے پرے ہو تم اپنے دماغ کی باریکی اور ہوشیاری سے پریشان ہو میں سے چونکہ میں بھی اپنے دماغ کے بوجھ کی وجہ سے پریشان ہوں جسم کا بیچ میں [illegible] دماغ پر

ہی دور ہو جاتا ہے۔ دماغی محبت کے لئے ایک دوسرے کے لئے جسمانی خواہش کا عشق حقیقی میں تبدیل ہو جانا لازمی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ تم بھی اسی جگہ پہ ہو جہاں میں ہوں، پر ابھی تم اس کو سمجھ نہیں سکیں۔ دو دماغوں کی آپس میں ٹکر خوش قسمت میاں بیوی کا جوڑا نہیں پیدا کر سکتی اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو بھول کرتی ہو۔

اسی بھول میں تم نے مجھے کئی بار اپنے دل کی حالت کے بارے میں اشارے کئے ہیں۔ تمہاری گوپال کے لئے بے دلی اور میرے لئے خواہش تو اتنی ظاہر ہے کہ سوائے گوپال کے یہ اور کسی کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی۔ اُس دن کی بات تمہیں یاد ہے جب میں نے تمہیں یہ کہہ کر کہ میں تمہیں اپنی شادی پر ضرور بلاؤں گا۔ تمہیں لطیف سا اشارہ کیا تھا کہ میری بیوی تم نہیں کوئی اور ہو گی۔ تم نے اشارہ کو سمجھتے ہوئے بھی اُسے نظر انداز کر دیا تھا۔ اور میری بیوی میں کیا کیا وصف ہونے چاہئیں۔ وہ سب گن ڈالے تھے۔ اُن میں سے کیا ایک بھی صفت تھی۔ جو تم پر پوری نہ اُترتی ہو۔ تم نے میری ہونے والی دلہن کی ناچتی اور ہاس انگیز آنکھوں۔ اُس کے نرم اور لمبے بالوں اُس کے نرم ہونٹوں اور اُس کے شگفتہ چہرے کی مسکراہٹ سب کو بیان کر ڈالا۔ اگر تم اپنے آپ کو اُس وقت آئینہ میں دیکھ پاتیں تو تمہیں شک کی گنجائش نہ رہتی۔ کہ تم اپنا ہی چترہ اتار رہی ہو۔ پر خیر یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے میرے بتانے سے تمہارا کیا فائدہ۔

ابھی سارو ہاں میری دلہن کے بارے میں تم نے ایک بات کہی جو تم پہ پوری نہیں اُترتی لیکن ہاں جو کہا کہ تمہاری بیوی ایسی ہو گی جو وقت پڑنے پہ سنجیدہ رہے اور موقعہ دیکھ کر بیر ہو چکے بھی ہو جاتے۔ تم سمجھتی ہو کہ تم جب چاہو شوخ ہو سکتی ہو۔ کاش کہ ایسا ہوتا ایسے لگ ہی تو چنچلتا میں بھی اتنی سنجیدگی بھری ہوئی ہے کہ آدمی کا دل قابو سے باہر بد قسمتی سے ہونے پاتا۔ تمہیں میں نے کہا ہے نہ کہ میرے خیال میں معیاری بیوی تو وہ عورت

ہے جو سادہ لوح اور بیوقوف ہو لیکن جس میں کبھی کبھی (GENIUS) کی بجلی چمک جایا کرے۔ صاف لفظوں میں اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بے وقوف عورت کیلئے کبھی کبھی قابلیت سے چمک اُٹھنا زیادہ آسان ہے۔ لیکن ایک ذہین عورت کا بیوقوفی کی باتیں کرنا اُتنا آسان نہیں، بیوی ایسی ہو، جو شوخ ہو، سادہ لوح ہو اور فلسفہ وغیرہ کی ردّی باتیں کر کے دماغ پریشان نہ کیا کرے پر موقعہ پڑنے پر ایسی پتے کی بات کہہ جائے کہ دانتوں تلے اُنگلی لیتے ہی بنے۔ تم شوخ کیا ہو گی۔ شوخی اور دماغ کی ذہانت دو متضاد چیزیں ہیں۔

اور وہ شیورلیٹ موٹر کی بات۔ مجھے معلوم ہے اور تمہیں بھی معلوم ہے کہ تم اپنے بھائی یا اور کسی نزدیک کے رشتہ دار کو ساتھ لئے بغیر باہر کبھی کو ملنے نہیں جاتیں تمہیں اُس دن کی بات یاد ہو گی۔ جب بہت زور دینے پر تم نے گوپال کے گھر جائے پینا منظور کر لیا تھا۔ وہ تو صرف تمہاری صحبت کا خواہشمند تھا اور تم سارے کنبہ کو ہی ساتھ لے گئیں۔ تمہارے ساتھ نہ صرف تمہارا بھائی ہی تھا۔ بلکہ بھائی کی منگیتر اور منگیتر کا بھائی بھی۔ بیچارا گوپال ٹکٹکی باندھ کر ہی رہ گیا۔ اور تم اُس کے ساتھ پانچ منٹ بھی گفتگو نہ کر سکیں۔ تم، تمہارے بھائی اور اُس کے دو دوستوں نے اپنا ایک علیحدہ ہی گروہ بنا لیا، اور تمام وقت آپس میں ہی باتیں کرتے رہے۔ پر میرے ساتھ تمہارا سلوک کتنا مختلف رہا ہے۔ تم نے مجھے بتایا: میں نے ایک نئی شیورلیٹ موٹر کار خریدی ہے۔ مجھے تنہائی بہت پیاری ہے۔" تم نے کہا" میں کئی بار بالکل اکیلی موٹر میں گھر سے نکل جاتی ہوں اور دُور، دُور ہاکس بےپر[1] پہنچکر ریت میں لیٹ جاتی ہوں۔ اور گھنٹوں ایسے ہی لیٹی رہتی ہوں۔ مجھے دُنیا کی بھڑکیلی محفلوں میں حصّہ لیکر کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ اُس وقت ریت میں لیٹی لیٹی میں چاروں طرف نظر دوڑاتی ہوں۔ آسمان پر نگاہیں ڈالتی ہوں۔ خدا کی قدرت۔ اُس وقت مجھے خیال آتا ہے

[1] کراچی سے کوئی بیس میل کی دوری پر خوبصورت سمندر کا کنارا

کہ کاش میرے ساتھ کوئی میری باتیں سمجھنے والا ہوتا۔ وہ باتیں جو میرے دل کی محدود جگہ میں ہی آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اُن کو اُکسا کر اُبھار کر باہر نکال لینے والا کوئی ہوتا۔ وہیں ہاکس بے پر میں نے کچھ زمین خرید کر ایک چھوٹی سی نہانے کے لئے لکڑی کی کٹیا (CABIN) بنوالی ہے۔ اس کی چابی میرے پاس رہتی ہے میں نے یہ کٹیا کبھی کسی اور کو استعمال کرنے کے لئے نہیں دی۔ یہ ایک طرح سے میرا مندر ہے دنیا کے شور و غل سے پرے۔ معاف کرنا ناراض تو نہیں ہو گئے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ تمہارے لئے بھی اس کٹیا کے استعمال کرنے کی ممانعت ہے تم مختلف ہو۔ مجھے معلوم ہے تم اس کا بیجا استعمال نہیں کرو گے۔ یہ چابی تم مجھ سے جس وقت چاہے لے سکتے ہو۔ میں تو عام طور پر صرف سنیچر اور اتوار کے دن ہی ہاکس بے جاتی ہوں۔ اگر تم نے بھی کسی ایسے ہی دن جانا ہوا۔ تو اکٹھے ہی چل پڑیں گے۔ تمہیں موٹر چلانا بھی بہت اچھا لگتا ہے نہ"

ہاں اچھا کیوں نہیں لگتا۔ میرے بھائی کے پاس بھی شیورلیٹ ہی تو ہے۔ اُس نے بھی نئی ہی خریدی ہے۔ میری چھکڑا موٹر اُس کے سامنے کیا ٹھہرے گی۔ جب بھی بھائی صاحب کراچی آتے ہیں بس اُن کی موٹر میرے پاس ہی رہتی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے اِس میں کتنی بار میں حیدر آباد تک بھی ہو آیا ہوں۔ کیا چلتی ہے گویا ہوا کو کاٹتی ہوئی گولی جا رہی ہو۔

اور ایک دن تم اتوار کے دن دوپہر کو میرے گھر آ پہنچیں۔ اکیلی۔ اپنی نئی موٹر میں۔ تمہارے بھائی کو کیا ہوا تھا؟ تمہارے باقی رشتہ دار کدھر تھے؟ تم نے میرے چہرے کی حیرانی سے بھانپ لیا کہ میں تمہارے اکیلی چلے آنے کی بات نہیں سمجھ سکا تم اپنے آپ ہی کہنے لگیں۔ ولیم کے بازو میں آج چوٹ آ گئی ہے۔ وہ نہیں آ سکا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہم بہت دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور ایسے ہی فیصلہ ہوا کہ باہر سیر کو چلنا چاہئے۔ ہم دونوں موٹر میں آ بیٹھے۔ تم کہنے لگیں۔ تمہیں شیورلیٹ کا چلانا اچھا لگتا ہے۔ تمہیں چلاؤ میں تو آرام سے بیٹھوں گی۔ میں ڈرائیور

والی سیٹ پر بیٹھا اور تم میری بغل میں۔ آہستہ آہستہ ہم آبادی کو پیچھے چھوڑ گئے۔ اور میں ان بوچھے ہاکس بے کی طرف بڑھنے لگا۔ تم باتیں کرتی رہیں۔ نہ معلوم کیا کیا کہہ گئیں معاف کرنا میں تمہاری باتوں پر اُس وقت زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا۔ ہاں مجھے کچھ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تم کوئی دل کا راز چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ تم کچھ گھبرا سی رہی تھیں۔ تمہاری آواز کانپ رہی تھی۔ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کیلئے آدمی اپنی زبان کا ہی آسرا ڈھونڈا کرتا ہے۔

ہاکس بے پر پہنچ کر میں نے موٹر روک دی۔ ہم دونوں اتر کر سمندر کے کنارے گھومتے رہے۔ اب تم نے باتیں کرنا بند کر دی تھیں۔ قدرت کے سناٹے میں سمندر کی لہروں کا شور خواہ مخواہ دل کی دھڑکن کو تیز کئے دے رہا تھا۔ ہم بیٹھ کر ریت میں گڑھا کھودنے لگے۔ چپ چاپ گڑھا کھودتے رہے۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک منٹ کے لیئے میں نے سوچا کہیں آج تک بھول میں رہا ہوں۔ تمہارا دماغ ذہین ہو۔ تمہاری باتیں فلسفیانہ ہوں۔ پر تمہارا جسم خوبصورت ہے از حد خوبصورت۔ دور سورج سمندر کے پانی میں آدھا ڈوب چکا تھا۔ سمندر میں غروب ہوتا ہوا سورج ہمیشہ خوبصورت معلوم ہوا کرتا ہے۔ یکایک تم گڑھا کھودتے کھودتے رک گئیں۔ سونے کی شعاعوں میں تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ اوپر اٹھا۔ آہ۔ اتنی خوبصورتی! "دیکھو مغرب کی طرف" تم نے کہا۔ "افق کا ارغوانی رنگ دیکھو۔ سمندر میں آدھا ڈوبا ہوا سورج ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔" میرے دماغ پر جو تمہاری خوبصورتی کا طلسم طاری ہو رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ یکایک میرے دل میں خیال آیا کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بالکل یہی کہتا۔ شاید سبھی ذہین لوگ ایسا ہی کہتے ہیں اور مجھے اپنی باتیں ہمیشہ مصنوعی اور کھوکھلی لگا کرتی ہیں۔ تمہاری باتیں بھی ویسی ہی لگیں۔ میں سوچنے لگا کہ اگر تمہاری جگہ کوئی الہڑ دیہاتی لڑکی میرے پاس بیٹھی ہوتی تو وہ کیا کہتی میں نہیں جانتا کہ وہ کیا کہتی، پر مجھے یقین کامل ہے کہ وہ وہ نہ کہتی جو تم نے کہا ہے

اُس کے دل کے خیالات سادہ چاہے ہوں مگر اُن کی پیش گوئی نہیں ہوسکتی۔ تمہارے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک ذہین شخص بتا سکتا ہے کہ تم کیا کہو گی محض علم سے ہمارے دماغ میں اتنی یکسانیت کیونکر آجاتی ہے۔ اُس گنوار لڑکی کی باتوں میں دوسروں کو حیران کرنے والی باتوں کا عنصر زیادہ ہوتا۔ شاید وہ اپنے جذبات میں بے قابو ہوکر میرے گلے سے لپٹ جاتی۔ شاید وہ بھولے انداز سے کہتی "میری آنکھیں کمزور ہیں"۔ شاید کچھ بھی نہ کہتی۔ گونگی بنی غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی طرف دیکھتی رہتی۔ پر ہاں وہ جو بھی کہتی یا نہ کہتی وہ سیدھا دل سے نکلا ہوا ہوتا۔ اُس میں دماغ کے دل پر تسلط اور قابو کی مہر نہ ہوتی۔ اِس لئے اُس کی باتیں مصنوعی اور کھوکھلی بھی نہ لگتیں۔ میں تو جذبات کے غیر محدود اُمڈتے ہوئے سمندر میں کھو جانا چاہتا ہوں۔ ہنسوں تو کھل کر جاہل دیہاتیوں کی طرح ہنسنا چاہتا ہوں۔ روؤں تو اتنا کہ مجھے اپنی بے وقوفی کا بھی خیال نہ آئے کہ آدمی رو دیا نہیں کرتے۔ تمہیں تو روسو کے الفاظ یاد ہی ہونگے کہ جوں جوں ہم قدرت سے پرے ہٹتے گئے ہیں ہماری زندگی میں دُکھوں اور پریشانیوں کا اضافہ ہوتا گیا ہے۔ اصل میں تو یہ پریشانی تہذیب کا دوسرا نام ہے بس جو روسو کو قدرتی حالت اور تہذیب میں فرق نظر آتا تھا، وہی مجھے دل اور دماغ میں نظر آتا ہے۔ دل اور عقلِ حیوانی کا پیچھا کرنے سے ہم قدرت کے قریب رہتے ہیں۔ بھرپور زندگی بسر کرتے ہیں۔ خوش رہتے ہیں۔ جیسے جیسے دماغ ہمارے دل اور جذبات پر قابو پاتا جاتا ہے۔ ہم قدرت سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ ہم دُنیا کی نظروں میں مہذب ہوتے جاتے ہیں ہم پریشان حال ہوتے جاتے ہیں لعنت ہے ایسی تہذیب پر جو ہمیں اپنے دل سے ہی متنفر کر دیتی ہے۔

بس یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ زیادہ تعلیم پا کر بھی میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ قدرتی زندگی قدرت کے قریب تر رہنے میں ہے۔ اِس سے دور بھاگنے میں نہیں لیکن تمہاری ہائیڈلبرگ کی تعلیم نے تم کو اپنے دل پر پورا پورا قبضہ دیدیا ہے پھر یہ

ویسٹ دم امیر تاجر کے ساتھ افریقہ چلے جانے کا فیصلہ کیوں؟ تو یہ سوچ بچار کا کام نہیں لگتا۔ کیا تم بھی جذبات کے زیر اثر آنے لگیں۔ مجھ سے ناراض ہو گئیں؟ میری لاپرواہی نے تمہاری زندگی برباد کر دی؟ مجھے اب سبق سکھانے افریقہ گئی ہو؟ ارے پگلی، یہ سبق کیسا؟ اتنی دُور جانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے تمہارے جسم کی خواہش نہیں تھی، وہ تو یہاں بھی کسی اور کے حوالے ہو سکتا تھا۔ پر آہ تمہارا دماغ، میری روتھ۔ اگر اجازت ہو تو کہہ دوں "میری اپنی روتھ" مجھے تمہارا دماغ تو چاہیے تھا۔ وہ بلند تر دماغوں کی ٹکر سے جو فلسفہ اور فن پیدا ہوتا ہے اُس سے تم نے دُنیا کو محروم رکھا ہے۔ اِس کی ذمہ دار تم ہو۔ افریقہ میں شاید تمہارے جسم کو تمام سہولتیں میسر ہو جائیں پر اپنے دماغ کو کیا افریقہ کے بے پناہ جنگلوں کے حوالے کر دو گی؟ آہ، میری اپنی روتھ، میں پھر پوچھتا ہوں۔ یہ کیسا سبق ہے؟"

میں نے ابھی یہ خط لکھا نہیں ـــــــ سوچ ہی رہا ہوں کہ یہ خط لکھ دوں یا نہ لکھوں۔؟

ہوگئی۔ مولوی امجد علی بھی خوش تھے کہ اُن کی نئی دلہن خوب رس بس گئی ہے۔

مولوی امجد علی گھر پر کم رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ قصباتی رجسٹری آفسوں کے ملاحظہ کے لئے دورے کرتے رہتے تھے۔ گھر پر جب آتے تو فائلوں کا انبار مگر فرصت کے اوقات میں وہ اپنے اہل کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے تعلیم پانے والے لڑکوں سے پوچھ گچھ اور بیوی سے ہنسنا بولنا وہ فرض کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ بیوی بھی ایک ڈیڑھ سال تک نہایت ہی اطاعت مندی کا ثبوت دیتی رہی تھی مگر ادھر چند مہینوں سے راشدہ چڑچڑی سی ہوگئی تھی۔ اکثر وہ مولوی امجد علی کو سخت سست بھی کہہ دیتی اور وہ اُسے پی جاتے۔ مولوی امجد علی کو تعجب تھا کہ راشدہ ایسی کیوں ہوگئی ہے اور گھر کے سارے لوگوں کو حیرت تھی کہ "خان بہادر" سا رعب دار آدمی بیوی سے ڈرنے لگا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ کنبہ کو دو بیویوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ تو انوکھی بات تھی کہ سرکار کے سامنے کوئی زبان ہلائے۔ مولوی امجد علی نے ابتدا میں یہ سمجھنا چاہا کہ کہ اُن کی نئی دلہن شاید امید سے ہوں، ایسی حالت میں عورتیں ذرا چڑچڑی ہو جاتی ہیں۔ وہ خوش ہوئے اور اُن کے مردانہ پندار کو تسکین سی ہوئی، لیکن راشدہ کو یہ آسرا نہ تھا جس کی بنا پر ممکن تھا۔ اس کا چڑچڑاپن دور بھی ہو جاتا۔ خان بہادر اسی خیال خام کے ماتحت سب کچھ سہتے گئے اور رفتہ رفتہ ان پر راشدہ کا رعب غالب ہوگیا۔ وہ راشدہ سے کترانے لگے۔ دورے پر سے واپس آکر بھی وہ مردانہ میں ہی رہتے اور فائلوں میں غرق۔

راشدہ ایک سال تک تو اپنی شادی شدہ زندگی کی منزلت کے کیف میں ڈوبی رہی مگر خودی کی تسکین کے بعد جوانی نے اپنا خراج طلب کیا اور یہ ادا نہ ہوسکا۔ شباب بپھر گیا۔ لیکن قید خانہ کی دیوار سے سر ٹکرانے کے علاوہ اور کیا چارہ تھا۔ جوانی کے مطالبے جب نہ پورے ہوتے تو راشدہ نے خودی کو کمک پر بلایا اور ملنے ملانے تحفہ تحائف اور زینت و آرائش پر خوب خوب وقت اور روپیہ صرف کرنا شروع کیا۔ کچھ دنوں کے لئے شباب شکست کھا گیا۔ مولوی امجد علی خاصے امیر تھے لیکن ہاری ہوئی، دبائی ہوئی جوانی

چھپ چھپ کر طرح طرح کے حملے کرتی ہے۔ راشدہ کا چڑچڑا پن اسی ان دیکھی مگر محسوس جوانی کی جھاگ تھا۔

خان بہادر کے عالی شان مکان کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں کا سلسلہ تھا۔ درمیان میں کوٹھی کا احاطہ اور ایک لانبی سی گلی حائل تھی۔ ان مکانوں کی بساط بس اتنی تھی۔ ایک چھوٹا سا برآمدہ اور اس سے لگی ہوئی ایک یا دو شکستہ حال کوٹھریاں ایک دو مکان ایسے بھی تھے جن کے عقب میں کھنڈر سی انگنائی تھی اور ٹوٹی پھوٹی چار دیواری لانبی گلی کے اندر مسلسل سات آٹھ بیتخانوں کی صفائی کے راستے کھلتے تھے۔ جن پر محض عذر کے لئے لکڑی کا اکھڑا ہوا ڈھکن یا سڑی ہوئی کواڑ کے آثار لگے ہوئے تھے۔ گلی کے ایک پہلو میں از کار رفتہ نالی دوڑ گئی تھی، جیسے پھولی ہوئی، سیاہ، بیمار و بیکار کوئی رگ ہو۔ نالی کیچڑ اور گندے پانی سے بھری ہوئی رہتی تھی۔ اور کبھی گلی کی سطح پر بھی پانی پھیل جاتا تھا بوسیدہ مکانوں کے سامنے کوڑوں کے ڈھیر بھی رہتے تھے۔ اور ان ڈھیروں کی آرائش کے لیے ٹوٹی ہوئی ہانڈیاں، اُن کے سیاہ پیندے، پھوٹے ہوئے گھڑے اور انکے کنکھوں کے دائرے، پھپھوند لگی ہوئی پیلی املی دال، ٹین کی پرانی زنگ آلود ڈھبری اور سیاہ چیتھڑے ہوتے تھے۔ ایک سیاہ کتا اکثر کوڑے کے ڈھیروں کو اس طرح انہماک کے ساتھ کریدتا رہتا تھا۔ جیسے آثارِ قدیمہ کا انکشاف کر رہا ہو۔ ان ہی مفلوک الحال مکانوں کے درمیان ایک چیز تھی۔ جسے مشکلوں سے کوٹھری اور آسانی سے بھوسا وغیرہ رکھنے کی جگہ کہہ سکتے تھے۔ ریوڑ چھپروں اور فرسودہ دیواروں کے درمیان ایک تاریک خلا سا اور بس۔ یہ خلا گلی کے بالکل ہم سطح تھا اور نالی کے کنارے۔ اس پر لوہے کے پتروں کا ایک جافری نما پھاٹک لگا ہوا تھا۔ روشنی سے آنے والی آنکھوں کو یہ خلا محض ایک بڑا سا تاریک دھبہ نظر آتا تھا۔ کچھ دیر میں جب نظریں ذرا مانوس ہو جاتی تھیں۔ تو اس تاریکی کے اندر سے مبہم شکلیں ابھرتی معلوم ہوتی تھیں۔ پانی سے چپچپی سی کچی زمین اور کھس بھسی سی نم دیواریں یہ کوٹھری سی جگہ بالکل اندھی تھی۔ دیواروں میں کوئی شگاف تک نہیں۔ کوٹھری کے حاشیہ

پکی مٹی کے چولھے تھے۔ دن بھر یہ چولھے بھائیں بھائیں اپنے بھوکے منہ پھاڑتے رہتے تھے۔ چھپر کی ٹھاٹ سے بندھی ہوئی کئی اونچی الگنیاں تھیں۔ جن پہ پھٹے پرانے کپڑے یا ڈیلی ڈیلی گٹھڑیاں ٹنگی ہوئی رہتی تھیں۔ کوٹھڑی کے کونوں میں لپٹی ہوئی چٹائیاں اور وسط میں بکھرے ہوئے برتن باسن ——— پیتل کے لوٹے، مٹی کی ہانڈیاں، اور چینی اکھڑے ہوئے تامچینی کے قاب ———

اِس کوٹھڑی میں بھانت بھانت کے لوگ رہتے تھے سب دور دراز کے گاؤں سے آئے ہوئے پیشہ ور، مزدور، اور پھیری والے۔ اکثر یہ لوگ دن بھر غائب رہتے۔ کبھی کبھار کوئی اکا دکا مزدور کوٹھڑی میں چٹائی پر لیٹا ہوا یا کچھ کام کرتا ہوا یا کچھ کام کرتا ہوا پایا جاتا۔ کوئی غلہ اور سبزی کی آڑھت میں قلی کا کام کرتا تھا۔ کوئی کولہ پھیری کر کے بیچتا تھا، کوئی چینا یا دام اور "ایک پیسے میں آدھا" کا خوانچہ لگاتا، کوئی چٹائی بنا کر بیچتا اور کوئی رکشا کھینچتا تھا۔ شام ہوتے ہی یکے بعد دیگرے وہ کوٹھڑی آباد ہونا شروع ہوتی مزدور تھکے ہارے آکر چولھا جوڑتے مصالحہ پیستے اور کھانا پکاتے تھے۔ دن بھر میں بس ایک بار، صبح کو کبھی باسی بھات بچ رہتا اور اُسی پر گذارا ہو جاتا۔ اندھیری کوٹھڑی دھوئیں سے اٹ جاتی تھی۔ اور مزدوروں کی آنکھوں میں پانی آ جاتا۔ مگر وہ آگ پھونکتے رہتے۔ اِن مزدوروں کے چولھے الگ الگ جلتے تھے سب کی ذات علیحدہ، لہٰذا سب اپنا بھات بھی جدا جدا پکاتے تھے۔ تاریک کوٹھڑی کے اندر مختلف چولھوں کی آگ کی روشنی میں بیٹھے ہوئے مزدور غول بیابانی سے معلوم ہوتے تھے۔ یہ زور زور سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ سویرے ہی کھانے پینے سے فراغت کر کے یہ منڈلی خوب شور و غل کرتی، گیت گاتی، گالیاں بکتی، قہقہے لگاتی، لڑتی بھڑتی، قصے کہانیاں کہتی، روز کے گزرے ہوئے واقعات پہ بے لاگ تبصرے کرتی اور بھجن بھی گاتی۔ غرض اِس کوٹھڑی کے لوگ محلے بھر کو سر پہ اُٹھائے رکھتے تھے۔ کبھی جو یہ مزدور پی پلا کر آتے تو اور غضب ہو جاتا۔ فحش باتوں کی بھرمار اور کھلی ہوئی گالیاں۔ شام سے لے کر آدھی رات تک قیامت

پھی رہتی۔

خان بہادر مولوی امجد علی نے شہر میں زمین خرید کر نیا مکان بنایا تھا۔ اس محلہ میں اور بھی معززین نے اسی طرح بڑے بڑے مکانات بنائے تھے۔ مگر ابھی تک محلہ میں زیادہ تر غربا کے مکانات ہی تھے۔ خان بہادر کے سونے کا کمرہ دوسری منزل پر مزدوروں کی کوٹھڑی کے سامنے پڑتا تھا۔ ان فرسودہ مکانوں کے سلسلے کے پرے ایک بڑا سا کھلا ہوا میدان تھا۔ یہ میدان کبھی کھیت تھا۔ اب فٹ بال گراؤنڈ کے کام آتا تھا۔ سونے کا کمرہ دوسرے کمروں کی نسبت اسی سبب سے زیادہ ہوادار تھا مگر یہ رات کی رات شورِ قیامت۔

راشدہ نے پہلے تو اس روزمرہ کے ہنگامہ کا کوئی خاص خیال نہ کیا تھا مگر اب جب کہ اس کا مزاج اکثر مکدر رہتا یہ شور و غل اس کے لئے عذاب تھا۔ اور جب یہ طوفان بدتمیزی مولوی امجد علی کے ہوتے ہوئے ہوتا تو راشدہ اور جل جاتی۔ اسے غصہ اتارنے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ آج اس کوٹھڑی کے مزدور حسب معمول شور کر رہے تھے کہ مولوی امجد علی سونے کے کمرے میں آ نکلے جہاں راشدہ تھکی تھکی نیند کو بلانے کی بے چین سی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جلی کٹی سنانے کے لئے اٹھ بیٹھی تھی۔ مگر اسے ابھی جی کی بھڑاس نکالنے کا پورا وقت بھی نہ ملا تھا کہ کچھ بھانپ کر خان بہادر کھسک گئے اور وہ زیادہ خشمگیں ہو کر دھپ سے پھر پلنگ پر لیٹ رہی اور ایک بیزار سے جھٹکے کے ساتھ اس نے دیوار کی طرف کروٹ بھی پھیر لی۔ جیسے وہ مولوی امجد علی کی نفرت انگیز صورت کو دفع ہوتے ہوتے بھی دیکھنے کی روادار نہیں۔ اسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ خشمگینی کا بارِ گراں کا بوجھ اور حسرت نفرت کا وزن اٹھائے جھنجھلائی اور تلملاتی رہی۔ نہ جانے کب راشدہ پر اننی تھکاوٹ طاری ہوئی کہ وہ سو گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ سامنے فٹ بال گراؤنڈ میں مزدوروں کا بہت بڑا مجمع ہے۔ اور وہ خود دریچہ کے سامنے کھڑی ہے سب مزدور اسے گھور گھور کے دیکھ رہے ہیں اور وہ انبساط و خفگی کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یک بہ یک

مزدور مکان کے اندر گھس آئے۔ اور مولوی امجد علی کو پکڑ لے گئے اور انہیں پیٹتے پیٹتے ادھ موا کر دیا اور پھر اسے لے گئے اور درمیان میں اونچی جگہ بٹھا کے اس کے سامنے ناچنے لگے اور رقص کرتے کرتے سجدہ ریز ہو گئے ——— وہ صبح کو بیدار ہوئی تو حد سے زیادہ مضمحل اور چور چور محسوس کر رہی تھی۔

راشدہ کی زندگی بیزار، اداس، خشمگیں اور مضمحل انداز میں گذر رہی تھی۔ ترستی ہوئی پیاسی جوانی اندر ہی اندر استری کے لوہے کی طرح سلگ رہی تھی۔ موانست کی خواہش کا دم گھٹ رہا تھا۔ جنس مخالف سے چہل اور چھیڑ کی تمنائیں کراہ رہی تھیں اور جنوں خیز محبت کے حسین شعلوں میں نہانے کی آرزو میں اس کی منجمد سے کیفیت زیست سسکیاں بھر رہی تھی۔

نرگس اس کے میکے کی ایک نوخیز خادمہ تھی۔ گورا رنگ اور کھلتی ہوئی صورت۔ وہ بہت شوخ، چنچل اور بے پرواسی تھی۔ اس کا شباب شکنجے سے آزاد تھا۔ حویلیوں میں پلی ہوئی جوانی شریف زادوں کے لئے تختۂ مشق کا کام دیتی ہے۔ نرگس خانہ زاد لونڈی کی نلتی، خانہ زاد لونڈی کی بیٹی اور خود بھی اسی طرح کی ایک لونڈی تھی۔ اس کے تیور سے شرفا کے خون کی آمیزش کا پتہ چلتا تھا۔ جو اس کے مادری خاندان کے سلسلے میں شاید مسلسل ہوتی رہی تھی۔ لیکن وہ شریف نہیں تھی۔ محض ایک لونڈی تھی۔ لوگ جسے حرافہ، قطامہ اور ولدالزنا کہہ کر پکارتے تھے۔

راشدہ اپنی مسہری پہ بیٹھی ہوئی تھکی تھکی انگڑائیاں اور نڈھال جمائیاں لے رہی تھی۔ کہ نرگس جھاڑو سنبھالے فرش آراستہ کرنے کمرے میں آئی۔ سورج دیر کا نکل چکا تھا۔ کھلے ہوئے دریچہ سے دھوپ آکر کمرے میں بکھر گئی تھی۔ راشدہ کا اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بے مقصد زندگی کاہل ہو جاتی ہے۔ نرگس راشدہ سے شوخ تو تھی۔ مگر ایسی بے تکلف نہیں۔ وہ راشدہ سے ڈرتی بھی تھی۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں اکثر پٹ چکی تھی۔ راشدہ کی نظر نرگس کے ہنستے ہوئے چہرے پر پڑی اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے پست تر

ہے۔ کوئی ادنیٰ تر مخلوق۔ نرگس آزاد اور خوش تھی اور وہ مجبور و غمگین۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ نرگس مالکہ ہے اور وہ خود خادمہ۔ اُسے اپنے حال پر بےساختہ رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں رقت طاری ہوئی اور اُس نے نرگس کو پاس بلایا ——

"نرگس!"

"جی!"

"سارے کام ختم ہو گئے؟"

"جی ہاں!"

"تو آج بڑی خوش ہے؟ کپڑے بھی صاف پہن رکھے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل بھی ہے کیوں ری؟" راشدہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

نرگس شرما سی گئی۔

"اور یہ کپڑے ملے دلے کیسے ہیں ری؟ اور سر کے سنوارے ہوئے بال بھی کھُل کھُل گئے ہیں؟" راشدہ نے بامعنی سوال کیا۔ وہ اِس وقت نرگس سے بےتکلف ہونا چاہتی تھی۔

نرگس شرما کر ہنسنے لگی۔

"رات اچھے صاف کپڑے پہن کر سو گئی تھی؟ چیزیں برباد کرنی خوب آتی ہیں بیہودی!" راشدہ کو ذرا سا رشک آمیز غصہ آ گیا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ اُس نے چھیڑ چھیڑ کر نرگس سے رات کی ساری گذری ہوئی باتیں پوچھ ڈالیں۔ نرگس کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی اُسے یہ بےتکلفی بڑی اچھی لگی۔ وہ غرور و مسرت سے پھُول گئی —— اور سارے واقعات کھل کر کہہ دیئے۔

"بدمعاش!" راشدہ نے جذبات سے متاثر ہوتے ہوئے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کا سانس تیز و گرم چلنے لگا۔ اُس نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا۔ اور رُک رُک کر نرگس سے پُر آرزو انداز میں پوچھا۔

"تیرے احمد بابو بڑے اچھے ہیں؟ بدذات اچھنال! بڑی بے ہودہ ... چھی! ایسا بھی کوئی کرتا ہے ..... دائی ماما کی ذات جو ٹھہری .....

یہ اپنی کمزوری بھرم رکھنے کی پُر تصنع ڈانٹ تھی۔

"اوں! ہم کا کرتے۔ احمد بابو بڑے کھراب سے ہیں۔ سب بات اچھی ہے بوبو۔ بس ایک بات بڑی کھراب ہے۔ سچ بولو!"

نرگس کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ راشدہ اس خواہش سے تلملا اُٹھی کہ کاش وہ بھی اسی طرح ہنس سکتی۔

مولوی امجد علی صاحب دوروں پر جاتے تو رہے اور راشدہ آپ ہی آپ کڑھتی رہی۔ وہ ہوتے بھی تو کیا تھا۔ جاڑے کی چاندنی۔ خضاب آلودہ داڑھی سے بوجھل تبسم۔ پُرشکن حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں کی ہوسناکیاں۔ ملتجی بڑھاپے کی امنڈے ہوئے شباب سے بھیک مضحکہ خیز حرکتیں اور نفرت انگیز شکست۔ راشدہ دن دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اس کے صرف دو مشغلے تھے۔ دریچے سے گلی اور دور کی سڑک کو تکتے رہنا اور نرگس سے اس کی جوانی کی کامیابی کی داستان سننا۔ وہ نرگس سے ایسی باتوں کے متعلق سوال کرتی جس کا نرگس کو گمان تک نہ ہوتا۔ احمد میاں کے تذکرے اکثر رہتے تھے اور دوسرے شریف زادوں کے بھی۔ یہ احمد مولوی امجد علی کا بھانجا تھا۔ اور اُن ہی کے یہاں رہ کر کالج میں بی۔ اے۔ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خوشرو سا نوجوان تھا۔ انہیں اور سینما کا بے طرح شوق اور لباس کا خبط۔ ادب و علم سے ذوق نہ تھا مگر فلمی گانے ازبر تھے۔ اگر اس کی زبان پر کوئی نیا گانا از قسم "پنگھٹ پر ایک چھبیلی، پانی بھرن کو آئی" سُنا جاتا تو سمجھ لیجیے کہ شہر میں کوئی نیا فلم آگیا ہے۔ سیگل کی طرح کرتا پہننا اور آدوسٹن کی شان سے ریکٹ بغل میں دابنا اُس کی معراجِ تخیل تھی اور انتہائی حسن کردار۔ احمد مولوی امجد علی سے ڈرتا تھا۔ راشدہ کا بہت ادب لحاظ کرتا اور نرگس پر فلمی تعلیمات کی عملی مشق کرتا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ ممانی جان اُس پر بہت مہربان ہیں۔ اُس

خیال، آرام کا لحاظ، یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اور کیا۔ رفتہ رفتہ ممانی بھی کوئی بات نہ سے خاصی دلچسپی لینے لگیں۔ اُس سے کالج کے دلچسپ قصّے سنتیں، ہیچ ہوا کے بیچارگی کے متعلق باتیں کرتیں۔ احمد خوش ہوا کہ چلو ماموں جان کی خشکی اور سختی کا ممانی جان نے کفارہ ادا کر دیا۔

راشدہ نے احمد کی تواضع کچھ یونہی انجان طور پر شروع کی تھی۔ سہرا ہے نوکرانیوں کو اس کے کھانے کے متعلق تاکید کر دیتی۔ نوکروں سے اس کی چیزوں کے بارے میں پوچھ لینا وغیرہ وغیرہ۔ آہستہ آہستہ احمد کی خاطرداریوں میں اُسے لطف آنے لگا۔ اُس کا یہ بھی جی چاہتا کہ احمد سے باتیں کرے۔ اُس کی کوئی نہ کوئی تقریب نکل ہی آتی۔ جانے کیسے پھر یہ ہوا کہ موقعہ پیدا کیا جاتا اور کچھ دنوں کے بعد یہ معمول سا ہو گیا کہ احمد اپنی باتوں سے ممانی جان کا دل بہلا رہا ہے۔

راشدہ کو اپنی ویران زندگی میں تھوڑی سی آبادی نظر آنے لگی تھی مگر اس آبادی پر وہ حکمراں نہ تھی اُس کے دن اب بھی ایک مضطرب بے شغلی اور راتیں ناکام بیتابی میں کٹتی تھیں۔ وہ طویل دوپہر اور پہاڑ سے دن کمرے کے دریچہ سے لگی کاٹ دیتی۔ وہ پہلو کے پوسیدہ مکانوں کے رہنے والوں کو جان پہچان گئی تھی۔ پرانا سفید لمبا نیلوں کا چشمہ لگائے ہوئے خمیدہ کمر بڑھیا گوالن یہ اپنی کوٹھری میں اکیلی جان سے رہتی اور دودھ سے بالائی نکال کر بیچتی تھی۔ اس کی بغل میں ایک چھوٹا سا غریب خاندان جس میں بہت باتیں کرنے والی عورتیں اور ایک لڑکا مرد تھا گلی میں بیٹھ کر پڑوس کی عورتیں ایک دوسرے کی جوئیں دیکھتی تھیں اور مولوی امجد علی کے احاطہ کی چاردیواری پہ میلے میلے کپڑے اور دو دو شکستہ گینڈرے سوکھنے کو ڈال دیتی تھیں۔ راشدہ ان گینڈروں کے مختلف رنگ کے پیوندوں اور جیلڑ کی طرح میل سے اٹے ہوئے بخیوں سے مانوس و شناسا ہو گئی تھی۔ مزدوروں کی کوٹھری کے عین پہلو میں ایک بہت ہی تنگ سا سائبان تھا جسے گھیر گھار کر زبردستی کوٹھری کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس میں ایک سیاہ رنگ بڑھیا میلے

سے گیندڑ رسے پر اوندھی جھکی ہوئی یا نالی کے کنارے بیٹھی ہوئی پائی جاتی تھی۔ اس کا سارا بدن بے حد پھولا ہوا تھا۔ اس کے سُتے ہوئے چہرے سے بڑھاپے کی شکنیں بھی دُور ہوگئی تھیں۔ اس کا بھیانک چہرہ لڑکوں کو ڈرانے کا ہوّا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ کھونٹے سے بندھی ہوئی ایک نوکیلی داڑھی والی بکری رہتی تھی۔ پیلی آنکھوں والی بکری سیاہ رو بڑھیا کی شریکِ زندگی تھی۔ اور سرمایۂ حیات۔ گلی کے دوسرے سرے پر ایک کھنڈر سے مکان میں تین خاندان رہتے تھے۔ ان سب سے بھی راشدہ واقف ہوگئی تھی۔ ایک درمیانی عمر کی مہترانی اپنی نوخیز بیٹی اور رنگا نے اور بڑے بڑے بالوں کا شوق رکھنے والے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک میونسپلٹی کی موٹر کا چھندلا ڈرائیور اپنی بہت سے بچوں والی رنگین ساریوں کی شوقین بیوی کے ساتھ تھا۔ اور ایک بیمار دمہ کی ستائی ہوئی گوری چٹی بڑھیا اور اس کی بے حد جوان بہو۔ یہ بڑھیا عریاں و فحش گالیاں بکنے میں وہ وہ جدت و ندرت پیدا کرتی تھی کہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا تھا۔

راشدہ طرح طرح کے پھیری کرنے والوں اور اُن کی منفرد صداؤں سے بھی آگاہ ہوگئی تھی ——— "ایک سلتیا پیسے میں تین سلتیا پیتھے میں" اور ——— "ہندولیب ..... چنیا باد ..... کھوئے کالڈ ..... " ٹوٹے ہوئے آخری لفظ پر ختم ہونے والی تبسم آفرین مدھم ہوتی ہوئی آواز غرض وہ دریچہ کے سامنے والی گلی کے جزئیات اور اس کے سارے متعلقات سے پورے طور سے واقف ہوگئی تھی۔ اور وہ ساری چیزیں اُس کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئی تھیں۔ راشدہ کو اب سامنے کی کوٹھری کے مزدوروں کا شور بھی گوارا تھا۔ اُن کے دم سے ویران شاموں اور اداس راتوں کی رونق تھی۔ اُسے کوٹھری والے مزدوروں سے ہمدردی تو نہیں دلچسپی سی ہوگئی۔ نرگس کے ذریعہ اُن کے حالات دریافت کرتی۔ روزی کی تلاش میں دور دور سے آئے ہوئے مزدور سال سال بھر گھر نہیں جاتے تھے۔ وہ جا بھی کیسے سکتے تھے

اوسطاً تین آنے روزینہ کمانے والے لوگ ایک آنہ اپنی ذات پہ خرچ کرتے تھے۔ اور مشکلوں سے مہینہ بھر میں چار روپے گھر کو بھوکے پیٹوں کے بھرنے کے لئے روانہ کرتے تھے "بیچارے مزدور!" کبھی کبھار راشدہ کو اُن کی حالت پر تھوڑا سا ترس آجاتا۔

اوائل گرمیوں کے دن تھے۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ صبح کو گلابی خنکی ہوتی تھی۔ اور گرم دوپہریں نہایت ارمان انگیز تھیں۔ راتیں آغوش میں کھنچی ہوئی نوجوان دلہنوں کی طرح مدہوش۔ کوئل اور فاختہ کی آوازیں دلوں کو برماتی تھیں۔ اور ہوا کے جھونکے جذبات میں تموّج پیدا کرتے تھے۔ غنودگی میں آرزوئیں انگڑائی لیتی تھیں اور جسم کا جوڑ جوڑ کسمساتا تھا۔

ایک خاموش دوپہر کو راشدہ اپنے دریچہ سے لگی بیٹھی تھی۔ نرگس بھی اس کے پاس کھڑی تھی۔ سامنے کی گلی غیر آباد سی تھی۔ مزدوروں کی کوٹھری کا پھاٹک تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اور دو لوٹ پر کپڑے ڈال دئے گئے تھے۔ اندر سے ایک آدمی نکلا اور گلی سے گذرتا ہوا سڑک کے کونہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں وہ کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر کوٹھری کے اندر واپس آ گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت گلی میں آئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر مزدوروں کی کوٹھری کے اندر داخل ہو گئی "بوبو!" نرگس نے کہا۔

"چُپ! ٹھہر تو!" راشدہ اُس کوٹھری کی طرف متجسسانہ دیکھتی رہی تین چار جوان مزدور اور جانے کدھر سے آ گئے اور سب کے سب اطمینان کے ساتھ کوٹھری کے اندر چلے گئے، کوئی بیس منٹ کے بعد ایک مزدور نے کوٹھری سے باہر نکل کر گلی کا جائزہ لیا اور اطمینان کر کے اندر واپس گیا۔ فوراً ہی وہ ادھیڑ عمر کی عورت چھپ سے نکلی اور گلی سے تیزی کے ساتھ گذر کر سڑک کے موڑ میں غائب ہو گئی۔ اُس کے آنچل سے بندھے ہوئے پیسے پیچھے جھول رہے تھے۔

"امی تو اُدھیڑ ہے یویو۔ چور ہے کے کونے پر ملکٹ اور ریوڑی بیچتی ہے۔ بیوہ ہے۔ چار پانچ لڑکا پھڑکا بھی ہے اس کے" نرگس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"چھی! بڈھی ہو گئی اور ایسا کام کرتی ہے . . . ."

راشدہ کو مولوی امجد علی کا خیال آیا اور وہ کُڑھ کر رہ گئی۔ اُس اُدھیڑ عمر کی عورت کے بالوں کو ابھی خضاب کی ضرورت بھی نہ تھی اور جو ہوتی بھی تو وہ خضاب کہاں سے لاتی۔ راشدہ نے اپنی طبیعت کی عجیب ناقابلِ برداشت کیفیت سے نجات پانے کے لیے نرگس سے مذاق کیا۔

"تو کیوں نہیں چلی جاتی ہے اُن جوان مزدوروں کے پاس؟"

"اونہہ . . . . ! ان کمینوں کے پاس؟"

شام تک راشدہ برافروختہ، مضمحل، چڑچڑی اور نڈھال سی رہی ——— شام کو احمد بھی کالج سے نہیں آیا۔ ادھر ہی سے کھیل میں چلا گیا۔ قریباً آٹھ بجے شب کو وہ گھر لوٹا تو راشدہ نے اُسے اپنے کمرے میں بلا کر بہت سی باتیں کیں۔ وہ اضمحلال اور افسردگی کا بار اُٹھا کر تھک چکی تھی۔ لہٰذا احمد کی صحبت میں معمولی معمولی باتوں سے مسرت کی تقریب پیدا کر رہی تھی۔ احمد کو حیرت ہوئی کہ آج ممانی جان اتنی بشاش کیوں ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج اُسے سیکنڈ شو میں سینما جانا تھا۔

راشدہ اپنے کمرے میں تنہا رہ گئی۔ وہ بے قرار سی نظر آ رہی تھی۔ کبھی بیٹھتی کبھی اُٹھتی، کبھی یونہی ٹہلنے لگتی۔ وہ دریچہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سامنے کے میدان میں نشہ پرور چاندنی پھیلی ہوئی تھی نیلے آسمان کی سیم آمیز گھلاوٹ جذبات کو لے اُڑتی تھی۔ موسم میں شکر سا رچا ہوا تھا۔ سڑک کے اُس پار ڈاکٹر والے مکان کے دریچہ سے بجلی کی روشنی میں ایک مرد اور ایک عورت کے جسم کا بالائی حصّہ معلوم ہو رہا تھا وہ خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ مزدور کوٹھڑی سے باہر نکل کر گلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

سجا خوب جمی ہوئی تھی سب مل کر زور زور سے گیت گا رہے تھے ——

"چھوٹی سی پہنا کے سیاں چھپتے چھپتا —— سیاں چھپ سے چھپتا! —— خوب ناٹھیا جمی ہوئی تھی۔ ایک گیت ختم ہوتا نہیں کہ دوسرے نغمہ کا بول فضا میں لہرانے لگتا۔

"چھپ نہ دیپ جوبنا۔ پٹ گاری دیپ ہو . . ."

راشدہ اِن گیتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے اُسے لطف آ رہا تھا۔ وہ بیتاب سی ہو گئی۔ خون کا ایک فوارہ اُس کے دل سے چھوٹ کر سارے جسم میں تیر گیا۔ اُس کے لب خشک ہو رہے تھے۔ اور اُس کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کا سانس تیز چلنے لگا۔ اُس پر ایک عجیب ہیجان اور انتشار طاری تھا تکلیف اور اذیت سے ملا ہوا، وہ دبے پاؤں سے اُٹھ آئی۔ اور ذرا رک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ دل منہ کو آیا جاتا ہے۔ دھک سے چل کر اُس کا دل رُک سا گیا اور پھر تیزی سے دھک دھک دھک چلنے لگا۔ گھر کے لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے اور دائیاں، مامائیں صحن میں لیٹی ہوئی تھیں یا باورچی خانہ میں برتن باسن دھو رہی تھیں۔ مولوی امجد علی دورے پر گئے ہوئے تھے۔ وہ سیدھی احمد کے کمرے کی طرف گئی اور جھانک کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ کپڑے بدل رہا تھا۔ صرف ٹائی باندھنی باقی تھی۔ راشدہ کو دیکھ کر وہ چونکتا ہوا۔

"کون؟ ممانی جان!"

پھر وہ ٹائی باندھنے اور سینما کے متعلق باتیں کرنے لگا۔

"آج سینما مت جاؤ!" راشدہ نے نہایت ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"بہت اچھی فلم ہے ممانی جان۔ زمانہ کے بعد دوبارہ آئی ہے صرف ایک شو کے لئے آیا ہے۔"

"میری طبیعت گھبرا رہی ہے مت جاؤ،" راشدہ نے ناز کرتے ہوئے کہا اور

آگے بڑھ کر وہ احمد کا شانہ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کوٹ پہن کر آئینہ میں اپنا آخری جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں اُسے اپنے سے بہت قریب راشدہ شانہ پکڑے ہوئے نظر آئی۔ اُس نے اُس کے ہاتھ کی لمس بھی محسوس کی اور حیرت زدہ ہو کر پیچھے مڑا۔ آج پہلی دفعہ اچانک اُس کی نظروں سے جیسے پردہ اُٹھ گیا ہو۔ راشدہ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے تمنائیں عریاں طور پر جھانک رہی تھیں۔ احمد کے لئے یہ نیا انکشاف تھا۔ بہت سی باتوں کا مفہوم اُسے اب سمجھ میں آنے لگا۔ وہ مبہوت کھڑا تھا۔ راشدہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اُسے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ آہستہ سے چھڑا کر وہ فوراً حیران و پریشان کمرے سے یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

"ممانی جان بہت دیر ہو رہی ہے"

راشدہ بھی اس کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور "میں بھی چلوں گی" کہتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے صدر دروازہ تک گئی۔ احمد تیزی سے نکلا چلا گیا۔ راشدہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ گھر کے لوگ دوڑے آئے۔ کوئی اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ کوئی دوڑا ہوا محلہ کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر آیا تو وہ ہوش میں آ کر دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ "ہسٹریا" اُس نے کہا۔ مامائیں اور نوکرانیاں آسیب کا سایہ سمجھ رہی تھیں۔ اور کوٹھری کے مزدور اپنا ناک گا رہے تھے۔

"میری پھلتی پھولتی جوبن کی ڈال
اسے کیسے میں رکھوں سنبھال کے..."

ممتاز مفتی

یہ دیوی

بابو اشمیر ناتھ کو دیکھ کر دیوی نے ایک پنکھا اُٹھا لیا اور اُن کے چرنوں میں جا بیٹھی۔ اُس کی جھکی جھکی آنکھیں آپ ہی آپ مسکرا رہی تھیں۔ بابو جی کیسے پریم سے اُسے دیکھ رہے تھے ——— ان دونوں کا سہاگ کتنا گہرا ہے۔ میں نے جی میں سوچا گھر کا سکھ اور پھر دیوی جیسی استری۔

محلے والے کہا کرتے ہیں "بابو جی کتنے بھاگوان ہیں جنہیں دیوی جیسی پتنی ملی ہے جتنی سندر ہے وہ اُتنی ہی بھلی ہے۔ سچ مچ دیوی ہے دیوی"۔ اور بابو جی مسکرا کر کہا کرتے ہیں "بھگوان کی دین ہے مہاراج، بھگوان کی دین"۔ اس سمے اُنکی آنکھیں آنند سے بھر جاتی ہیں۔ اور شاید اُن کا جی چاہتا ہے کہ وہ دیوی کے پاس جا بیٹھیں اور بیٹھے اُسے ہی دیکھتے رہیں۔

حالانکہ دیوی اُن کی دوسری بیوی ہے۔ اور بابو جی عمر میں اُس سے کہیں بڑے

ہیں لیکن دیوی کو ہم نے کبھی آنکھ اُٹھا کر چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چلتی ہے تو پاؤں میں اک ہلکی سی پیاری سی روانی۔ گویا کسی ساکن جھیل میں کوئی ناؤ آپ ہی آپ بہہ رہی ہو۔ البتہ اگر آپ اُس سے کچھ پوچھ بیٹھیں تو اِک آن کے لئے اُس کے ہونٹوں میں اِک خم سا پڑ جائے گا۔ آنکھوں میں ایک چمک لہرا جائے گی۔ اور نگاہیں جھک جائیں گی لیکن اُس کا جواب مختصر ہوگا۔ اور اُس کی کومل آواز میں شوخی نہ ہوگی۔

دیوی کو دیکھ کر مجھے نرملا یاد آجاتی ہے —— دیوی کے تصور میں نرملا کا خیال۔ میرے دل میں جانے کیا ہوتا ہے اُس سے۔ گویا چینی کی دوکان میں کوئی ہاتھی آگھستا ہے۔ پھر میرے دل میں دیوی کو دیکھنے کی خواہش اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے بس دیوی ہی کو دیکھتا رہوں۔ اُس سمے بھی تو پربھا بھی مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی ہے اور کہتی ہے "موہن بھیا۔ صرف ایک ہی سہارے پر جینا۔ نہ بھائی۔ نہ جانے یہ وہ سہارا کب ٹوٹ جائے" پربھی نے مجھے دیکھنے سے کبھی منع نہیں کیا۔ وہ جانتی ہے کہ نرملا سے مجھے گھر کا سکھ اور پیار نہیں ملا۔ نرملا صرف اپنے لئے جیتی ہے۔ اپنے لئے ہی جینا جانتی ہے اور اسی وجہ سے میرا گھر اتنا ویران رہتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں دکھی ہوں اِس لئے وہ مجھے کچھ نہیں کہتی۔ بلکہ جب میں کھڑکی میں سے دیوی کے گھر میں جھانکتا ہوں تو وہ میرا ساتھ دینے کی خاطر میرے پاس کھڑی رہتی ہے۔ اور اکثر دیوی کو دیکھتے ہوئے جب میری آنکھیں جانے کیوں چمک اُٹھتی ہیں تو وہ کہا کرتی ہے " اونہوں بھیا! ابھی پوجا کا وقت نہیں ہوا۔" پھر جب میں حیرانی سے اُس کے منہ کی طرف دیکھتا ہوں تو اُس کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ ناک پسینے سے تر ہو جاتی ہے اور وہ مدھم سی آواز میں کہتی ہے "یہ نہ بھولو موہن کہ وہ دیوی نہیں ناری ہے ناری۔" "پربھی" میں کہتا ہوں "ناری اور دیوی میں تھوڑا ہی فرق ہے۔" اور وہ جواب دیتی ہے "ہاں! —— لیکن بھیا۔ دیوی اور ناری میں اُس سے بھی کم۔"

میں اور پربھی دونوں کھڑے دیوی کو دیکھ رہے تھے۔ بابو شمبھر چارپائی پر لیٹے ہوئے

تھے اور دیوی چوکی پر بیٹھی انہیں پنکھا کر رہی تھی۔ بابو جی دورے سے واپس آئے تھے اور دونوں پتی پتنی اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرے لئے یہ پہلا دن تھا کہ اُن دونوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بابو اکثر دورے پر رہتے ہیں۔ مجھے بھی تو جیجی کے گھر آئے ابھی یہی سات آٹھ دن ہی ہوئے ہوں گے۔ گھر میں صرف دیوی، پرکاش اور بابو کشمیر رہتے تھے۔ پرکاش بابو جی کا چھوٹا بھائی تھا۔ مگر میں نے پرکاش کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ چونکہ وہ اپنے کمرے ہی میں رہا کرتا اور اُس کا کمرہ گھر کے دوسرے کونے میں تھا
"یہ سامنے جو مکان خالی پڑا تھا نا۔ اس میں نئے کرایہ دار آ گئے ہیں" دیوی نے بابو جی کے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا ہوا ———— تمہارے لئے رونق بڑھ جائے گی۔ بابو جی نے ہنس کر جواب دیا۔

دیوی نے آنکھیں جھکا لیں اور پنکھے کی ڈنڈی سے زمین کو کریدتے ہوئے بولی۔ "بھگوان نہ کرے میرا کیا پڑوسیوں بنا جی نہیں لگتا۔ میری رونق تو آپ ہی ہیں۔"

بابو جی کا منہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ "تو خود ہی تو کہا کرتی تھی کہ پڑوس میں کوئی بسے تو ——"

"پر وہ تو کوئی عیسائی عورت ہے۔ اب سُنا ہے دایہ کا کام کرتی ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوا" بابو جی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی۔ "دایہ آ گئی تو بھگوان چاہے منّا بھی آ جائے گا۔"

دیوی کو لجاتے دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ "سنا تم نے جیجی۔" میں نے کہا "ہوں! سُن رہی ہوں" وہ بولی۔

بابو جی کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہے، پھر کہنے لگے۔ "پگلی تو نہیں جانتی ان عیسائیوں سے سیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔"

"بھگوان نہ کرے میں اُس سے کچھ سیکھوں۔"

"کیوں خیر تو ہے؟" بابوجی گھبرا سے گئے۔

"کچھ نہیں ـــــــ" دیوی بولی۔ "اجی پرکاش کو کیا معلوم کہ کیسی ہوتی ہیں یہ کٹنیاں۔"

"پرکاش!" بابوجی اُٹھ بیٹھے۔ "پرکاش کی کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہوگی۔ آخر وہ ابھی نوجوان ہی ہے نا۔ بس اُس ترس کے پھانسے میں آ گیا۔"

"تو بات تو کر ـــــــ کیا کیا ہے پرکاش نے؟"

"آخر میں پرکاش کی بھابی ہوں۔ میں نہ رکھوں اُس کا خیال تو کون رکھے اگر بات نکل گئی تو کتنی بدنامی ہوگی۔ لوگ کہیں گے آخر پرائی ہی تھی نا لڑکے کا خیال نہ رکھا۔"

"لیکن بات کیا ہے۔ تو مجھے بتا تو سہی؟" بابوجی چڑ کر بولے۔

"کیا بتاؤں آپ کو ـــــــ آپ دورے پر چلے جاتے ہیں اور وہ بی بی بن ٹھن کر سارا دن پرکاش کے سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ آپس میں اشاروں سے باتیں بھی کرتے ہیں ـــــــ میں کہتی ہوں اگر کسی نے دیکھ لیا تو دنیا کیا کہے گی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ اُدھر وہ بیٹھی تھی۔ اِدھر پرکاش کھڑا تھا۔ جانے کیا کرتا تھا۔ کوئی اشارہ ہوگا۔ پہلے تو اپنی انگلیوں کو چومتا رہا۔ پھر اُس کی طرف یوں ہاتھ چلایا جیسے ہوا میں کبوتر چھوڑ رہا ہو۔"

"ہوں۔ تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے؟" بابوجی سر پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئے۔

"بھگوان جانے مجھے گمان بھی نہ تھا کہ پرکاش ایسا کرے گا۔ میرے سامنے تو یوں آنکھیں جھکائے بیٹھا رہتا ہے جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔"

"اور تو کیا تیرے سامنے بھی کبوتر چھوڑا کرتے ہیں؟" بابوجی نے غصے لیٹے ہوئے کہا۔

"ایسی بات کہتے لاج نہیں آئی آپ کو" دیوی نے آنکھیں جھکا کر نیچے کی ڈنڈی سے زمین کریدتے ہوئے کہا۔ اُس کے منہ پر سُرخی جھلملا رہی تھی۔

بابوجی جوش میں اُٹھ بیٹھے "غصہ نہ کرو۔ دیوی میرا مطلب اُس نالائق سے ہے۔ بالکل ہاتھوں سے نکل گیا ہے وہ"

چند ایک ساعت کے لئے وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر دیوی آپ ہی آپ بولی "میں اگر کبھی اُس سے کہوں۔ پرکاش رسوئی میں آکر کھانا کھا لو تو کہا کرتا ہے۔ نہ بھابی مجھے کھانا یہیں بھیج دو۔ رسوئی میں عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں ——— جیسے اُسے عورتوں سے نفرت ہو"

وہ رسیلی سی آواز سے ہنس پڑی ——— "میرے پاس بیٹھنے سے تو یوں گھبراتا ہے جیسے میں اُس کی بھابی ہی نہیں۔ بات تک کرنے کا روادار نہیں ——— اور اب اُس نرس سے آنکھیں لڑاتا! تو یہ آج کل کے لڑکوں کا کیا اعتبار"

جیجی نے میری بانہہ پکڑ لی اور کہنے لگی "چلو موہن اب چلیں۔ بیچارے دُکھ سُکھ کی باتیں کر رہے ہیں۔ کہہ سُن لینے دو اُنہیں۔ پھر آجانا تم۔

میں سوچ رہا تھا دیوی کی شکایت بھی کتنی رنگین ہے۔ شکایت تو معلوم ہوتی ہی نہیں۔ ذرا ٹھہرو۔ جیجی نے کہا۔

دیوی کے ماتھے پر ایک پیاری سی تیوری بن گئی "مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا پران ناتھ" اُس نے جھکی جھکی آنکھوں سے کہا "کہ آپ سے بات چھپاؤں۔ جانے استریاں کیسے پتی سے دل کی بات چھپا رکھتی ہیں ——— آپ کے سوا میرا ہے ہی کون"

اُس نے ایک آہ کھینچ کر کہا۔

"نہایت بُری حرکت ہے پرکاش کی" بابوجی سوچتے ہوئے بولے۔

"اُسے کچھ میرا ہی لحاظ ہوتا میرے ہوتے ہوئے۔ گھر میں۔ اُس مشٹنڈی سے آنکھیں لڑاتا۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ چاہے آپ میری بات کا بُرا ہی مانیں"

"لیکن میں کب کہتا ہوں کہ وہ ایسی بیہودہ حرکتیں کرتا پھرے ——— نالائق!"

"پھر ان محلے والیوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں نا کسی نے دیکھ لیا تو ہزار سُن باتیں بنائے گی۔ وہ گردھاری کی ماں تو ایسے موقعے کے انتظار میں ہے۔ اُسے تو بھگوان دے ایسی بات۔ ایک ایک کی دس دس سنائے گی۔ کہے گی آنکھیں لڑانے کے لیئے گھر میں نہیں کوئی کہ محلے والیوں کو گھورتا پھرتا ہے۔ گھر میں جو جوان بھابی ہے ——— آخر اس بات میں میری ہی بدنامی ہوگی نا۔"

"دھرم سے کہتا ہوں اگر اب کے گردھاری کی ماں نے کوئی بات کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔" بابوجی نے غصے میں کہا۔

"پر فضول جھگڑا کرنے سے فائدہ۔ اس بات کا کوئی انتظام کر دیجیے بس نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

بابوجی غصے میں اُٹھ بیٹھے۔ "وہ ہے کہاں۔ پرکاش ہیں اُسے بلا کر ابھی ڈانٹتا ہوں نا۔ کہاں ہے وہ؟"

"اے ہے جوان لڑکا ہے۔" دیوی نے گھبرا کر کہا۔ "جوان لڑکے بھی کیا ڈانٹ ڈپٹ سہتے ہیں۔ اگر لڑکا چڑ گیا تو ———"

"چڑتا ہے تو بے شک چڑ جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا ماں کے پاس گاؤں چلا جائے گا۔"

"چلا جائیگا!" دیوی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"جانا چاہتا ہے تو بے شک آج ہی چلا جائے۔"

"پر دُنیا کیا کہے گی۔ پران ناتھ۔ یہ بھی تو سوچیئے نا۔"

"دُنیا جو جی چاہے کہے۔ ہمیں دُنیا کی پروا نہیں۔"

"لیکن سارا الزام تو میرے سر آئے گا۔ ماں کہے گی بھابی نے لڑکے پر الزام لگا کر گھر سے نکلوا دیا۔"

دو ایک ساعت کے لئے وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر دیوی پنکھے کی ڈنڈی سے زمین کریدتے ہوئے بولی۔ گویا اپنے آپ سے کہہ رہی ہو" وہ اور بھابیاں ہونگی جو دیور کو دیکھ کر جل بھن جاتی ہیں۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ لڑکے کو گھر بھجوا دوں۔ توبہ! مجھ سے تو یہ نہ ہوسکے گا۔ مجھ پر تو کھانا پینا حرام ہو جائے گا"

"چلو بھیا اب چلو بھی۔ چائے کا وقت ہو رہا ہے" بھیجی نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا لیکن مجھے جانے سے انکار کرتے دیکھ کر وہ مایوس ہوگئی اور کہنے لگی "اچھا بھگوان تمہیں شکتی دے" اور پھر آپ پاس ہی کرسی میں بیٹھ گئی۔

"بھگوان کی دین" میرے دل سے آواز آئی اور میری آنکھیں اک شوق سے دیوی کو ڈھونڈنے لگیں۔

وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اُسے یوں مغموم دیکھ کر میرے دل میں عقیدت کی اک موج سی اُٹھی میں مبہوت کھڑا رہا۔

"بھگوان جانتے مجھے پرکاش سے یہ امید نہ تھی" بابو جی نے کھوتے ہوئے انداز میں کہا۔

میں تو خود بڑی حیران ہوں۔ وہ چونک پڑی۔ آخر اُس کرنٹی میں ہے ہی کیا۔ بھدے سے نقش اور بیٹھی سی ناک۔ ذرا آنکھ موٹی ہے۔ لیکن کیسی دھوئی دھائی آنکھ ہے اُس کی۔ اور بھگوان جھوٹ نہ بلوائے ہونٹ تو موٹائی میں مجھ سے تگنے ہونگے"

بابو جی کی آنکھیں چمک اُٹھیں "تم اپنی بات نہ کرو۔ روپ میں بھلا تمہاری برابری کون کرسکتی ہے"

"آپ نہ کریں مذاق تو کون کرے" دیوی نے شرم سے آنکھیں جھکا کر کہا "روپ ہوتا تو" ـــــــ اُس نے ایک ہلکی سی آہ بھری۔

"میری آنکھوں سے کوئی دیکھے ـــــــ" بابو جی چمک کر بولے۔

"آپ کا کیا ہے۔ آپ تو یونہی چھیڑتے رہتے ہیں مجھے"۔ دیوی نے لجا کر کہا۔

دو ایک منٹ وہ دونوں خاموش رہے پھر بابوجی "جانے پرکاش کو کیا ہوگیا ہے ان دنوں معلوم ہوتا ہے اُس کے دل میں محبت ہی نہیں رہی ہماری۔"

"مجھ سے تو ناراض معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں جب آپ دورے گئے ہوئے تھے۔ مجھے بیٹھے بٹھائے کچھ ہوگیا۔ جانے کیا ہوا۔ دل بیٹھنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ میں نے پرکاش کو آواز دی۔ میں نے کہا دیکھو تو کیا ہے مجھے۔ دل گھبرا رہا ہے معلوم ہوتا ہے بخار ہو رہا ہے۔ دیکھو تو میں نے نبض دکھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پر وہ دور ہی سے کہنے لگا میں ابھی لیڈی ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں۔ ہاتھ تک لگا کر بھی نہ دیکھا مجھے۔"

دیوی یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ بابوجی نے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے "آج کل کے پڑھے لکھے لڑکے تو چھوٹی سی بات پر بھی ڈاکٹر کی طرف بھاگ اٹھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے اور اپنی توند پہ ہاتھ پھیرنے لگے۔ اُدھر دیوی گم صُم بیٹھی تھی۔ گویا کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

"میرا خیال ہے" بابوجی بولے "اب ہمیں پرکاش کا بیاہ کر دینا چاہیئے۔"

دیوی چونک پڑی۔ ایک آہ بھر کر کہنے لگی "یہ جانے کونسی روپ وتی لائیگا وہ۔"

"بھئی کیا خوب یاد دلایا تم نے۔ اگر تمہاری سہیلی روپ وتی سے اُس کا بیاہ ہوجائے تو۔ لڑکی بھی اچھی ہے اور ذات کے بھی وہ کھتری ہیں۔"

"پر۔ پرکاش اُسے کب پسند کرنے لگا۔ بیچاری کی سیدھی سادھی شکل ہے۔ میری طرح۔ اور اُسے آج کل کی لڑکیوں کی طرح آنکھیں مٹکانا نہیں آتا۔"

"میں کہتا ہوں تو اپنے متعلق کس بھول میں ہے۔ یاد ہے جب تو دلہن بنکر آئی تھی۔ محلے والیاں دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔ دھرم سے آنکھ نہیں ٹکتی تھی۔"

"ہاں یاد ہے" دیوی نے مسکرا کر کہا "اُن دنوں پرکاش چھوٹا سا تھا۔ سارا دن

میرے اردگرد دیوانی بنا پھرتا تھا۔ لیکن اب تو مجھ سے بات تک کرنے کا روادار نہیں۔"

"یہ تیری بھول ہے۔ جوان لڑکا ہے۔ تجھ سے شرماتا ہے۔"

"کیوں شرمانے کے لئے کیا میں ہی رہ گئی ہوں۔" دیوی کا منہ جانے کیوں لال ہو گیا۔

معاً مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میرے پاؤں تلے زمین سرک گئی ہو اور میں اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا ہوں۔ "جیجی!" میرے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ جیجی نے بڑھ کر مجھے تھام لیا اور کہنے لگی "دیوی کو دیکھا کرتے ہیں موہن، اُس کی باتیں نہیں سنا کرتے وہ دیکھو" اُس نے بابو کی طرف اشارہ کیا۔ دیوی پجاری کے من میں ہوتی ہے۔ مورتی میں نہیں ــــــ سنو تو۔"

بابو جی پیار بھری نگاہوں سے دیوی کو دیکھ رہے تھے۔ "کیسی پگلی ہے تو۔ بالکل بھولی ہے۔ سچ مچ دیوی ہے دیوی۔"٭

احسان دانش

شاعر

انسان و خداوند کے مابین ہے شاعر
اِک جنسِ درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت
فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خوددار
جبریل کی پرواز پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت دلِ فرعون کا انکار

بھیک

صبح کا آغاز آنے ہی کو ہے انجام پر
سرخ چھاپوں کی سیہ چُنری تھی دوشِ بام پر
چوک کے کونے پہ لیٹر باکس سے بالکل قریب
جمع رہتے ہیں جہاں مزدوری کرنے کو غریب

بھیک

بند دکان کے تھڑے پہ اک گدائے بے دماغ
زہد کے سینے کا پھوڑا فقر کے ماتھے کا داغ
نشہ سے آنکھوں میں سرخی سرخ تر ہوتی ہوئی
شب کی آمد سے شرارت میں سحر ہوتی ہوئی
چیتھڑوں سے کھردرا پن چہرہ پہ آسیب میں
جیسے کھل جاتی ہیں درزیں سوکھ کر تالاب میں
بکسوں کا ڈپٹہ ڈھاٹے بال بکھرائے ہوئے
داؤں میں اپنے کھڑا تھا ہاتھ پھیلائے ہوئے

دے رہا تھا یہ صدا رفتار گاہِ عام پر
جانے والے کچھ تو دیتا جا خدا کے نام پر

ایک منعم چند معمولی سے انسانوں کے ساتھ
جا رہا تھا تانے ڈالے ہوئے جیبوں میں ہاتھ
خال و خد سے بے ثباتی کے قرینے آشکار
روغنی خوراک پر بوڑھی جوانی کا مدار

سن کے اس آواز کو اس خود سر و خودکام نے
چار پیسے گن کے یوں پھینکے گدا کے سامنے

سلطنت بخشی ہو جیسے شہ نے محتاج کو
تج دیا ہو جیسے اوچھے شہ نے تخت و تاج کو
جیسے اک رہزن امیر کارواں کے بھیس میں
جیسے ابلیس لعیں نوشیرواں کے بھیس میں

ہم سمجھتے ہیں مگر احسان ان اسرار کو
فطرتِ منعم کہاں دیتی ہے کچھ نادار کو

چلچلاتی دھوپ میں سائے کی شادابی کہاں
شعلۂ عصیاں میں شبنم کی سحر تابی کہاں
ظلمتِ تزویر میں رخشندگی ممکن نہیں
خوئے فرعونی میں ذوقِ بندگی ممکن نہیں
ان کا پیشہ ہے اک ایسی جماعت کی رہنے
خود کو جو مجبور سمجھے ان کو ان داتا کہے
خاک سے اٹھنے نہ دیتے آسماں جس کی نگاہ
بے حسی سے ہو چکا ہو جس کا ہر جوہر تباہ
بزدلی ہو جس کی فطرت بے حیائی جس کی خو
جہل نے برباد کیا ہو جس کی غیرت کا لہو
کام جس کا ہو فقط کلمۂ بھیک کے دامن تک
ظرف ہو محدود جس کا کاسہ و کشکول تک

بھیک کے ٹکڑوں پہ ہو جس کا مدارِ زندگی
منعموں کو جو کہے پروردگارِ زندگی!

ابدا

شیلا سیٹھ

ربڑ کی گڑیا

افراد

گارگی ۔ ایک جوان عورت ۔ عمر ۲۱۔سال

اماں ۔ اُس کی ساس ۔ عمر ۴۵ سال

شام لعل ۔ اُس کا خاوند ۔ عمر ۳۰ سال

بھگارسلو ۔ ایک جوان عورت عمر ۲۵ سال

بچے ۔ نوکر ۔ کانسٹیبل وغیرہ

[سین :۔ ایک کھلا برآمدہ جس کے سامنے دو چکیں لگی ہوئی ہیں ۔ بیچ والی سب سے بڑی چک اُٹھی ہوئی ہے ۔ دائیں بائیں دو دروازے ہیں ۔ بائیں طرف والا دروازہ کھانے والے کمرے میں کھلتا ہے اور دائیں طرف والا باہر کی طرف ۔ برآمدے میں

دو آرام کرسیاں ایک چارپائی اور ایک بچے کا کوٹ پڑا ہے

وقت ۔ صبح نو بجے کے قریب۔ اماں چارپائی پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی ہے ۔ اور گارگی ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں لے کر گھوم رہی ہے ۔ بچہ لگاتار روئے جا رہا ہے

شام لعل اُس کھانے والے کمرے میں سے منہ میں پان ڈالے اور ہاتھ میں اخبار پکڑے نکلتا ہے]

شام ۔ کہیں اس کے پیٹ میں درد تو نہیں ؟

اماں ۔ شام بیٹا ۔ کیوں نہیں کھڑے کھڑے ڈاکٹر گھوش کو بلا لاتے ۔ بے چاری بہو رات بھر سے پریشان ہے ۔ ایک پلک بھی تو سونے نہیں دیا اس نے بیچاری کب سے اسے لئے گھوم رہی ہے ۔

گارگی ۔ (بچے کو پچکارتے ہوئے) آں ۔ آں . . . . اور اپنا حال بھی تو دیکھئے ۔ کیوں نہیں آپ دو گھڑی آرام کر لیتیں ۔

شام ۔ عجب مصیبت ہے ادھر دفتر پہنچنے کا وقت ہوا جاتا ہے اور ادھر ڈاکٹر کی ضرورت بھی آن پڑی ہے کیوں نہیں اماں کوئی دوا پلا دیتیں ۔

اماں ۔ (اُٹھتے ہوئے) اپنی دوائیاں کر کے تو ہار چکی ہوں ۔ ابھی کچھ دیر ہوئی سونف چبائی تھی ۔ وہ بھی پلا دیکھی ہوں ۔ زہر مو ہرا گھونٹ کے دیا تھا ۔ کچھ فرق ہی نہیں پڑا ۔ بیچارہ ویسے ہی بلکے جا رہا ہے ۔ جب تم چھوٹے تھے تو میں تمہیں گرمیوں کے شروع ہوتے ہی تھوڑا زہر مو ہرہ دیدیا کرتی تھی ۔ ہاضمہ کبھی بگڑا ہی نہ تھا ۔ اس نگوڑے کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے ۔ (گارگی سے ~~تو مجھے~~ ذرا دو بچہ لے لیتی ہے) نہ نہ ۔ رونا میرے لال بس بس بس (بچہ روتا ہے)

شام ۔ تو پھر کیا کہتی ہو ۔ ڈاکٹر گھوش کے پاس ہو آؤں ۔

گارگی ۔ (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) تمہیں دیر ہو جائے گی تو دفتر والے تو کچھ نہ کہیں گے ۔

شام۔ (کچھ بگڑ کر) دفتر میں کونسی ماپیٹ کی جائے گی۔ پر سچ تو یہ ہے۔ مجھے یہ دھندے پسند نہیں۔ آرام سے دفتر جانا کبھی میسّر نہیں۔
اماں۔ (بچے سے) اوں۔ اوں۔ نا۔ نا۔ نا (شام لعل سے) ابھی کون سا دفتر کا وقت ہوا ہے۔
شام۔ نو تو کب کے بج چکے ہیں۔ اور جانے کا کونسا وقت ہوگا۔
اماں۔ (دیکھ کر) تو جاؤ نا۔ رونے دو اسے۔ ضرورت پڑی تو کسی پڑوسی کو بلوا لونگی۔ تم سے مطلب۔
شام۔ (شرمندگی سے) پڑوسی سے کیوں کہو گی کسی کو تمہارا کام کرنے کی کیا پڑی ہے۔ اچھا اگر دیر ہوگی۔ تو دفتر ٹیلیفون کر دوں گا۔ اور کیا (اخبار پھینک کر) یہ لو میں تو چلتا ہوں۔
گارگی۔ (اخبار اٹھا کر) تم ڈاکٹر کو بھیج دو۔ خود گھر واپس آؤ گے تو تمہیں بہت دیر ہو جائے گی۔
شام۔ اب اُس کا فکر کیوں کرتی ہو۔ وہ میں خود دیکھ لوں گا (جاتا ہے)
(اماں بچے کو پچکارتی جاتی ہے۔ رونا کم ہوتا جاتا ہے میٹھی آواز میں اماں ایک لوری گانے لگتی ہے "سو جا ننھے راجہ لعل پلنگ پر سو جا)
گارگی۔ (دھیرے سے) اسے کوٹ میں ڈال دیجئے۔ اب تو سو گیا ہے۔
اماں۔ کچی نیند اکھڑ گئی تو بہت بُرا ہوگا۔ ایک تو رات کی تکلیف نے بچارے کو اُندھا کر دیا ہے۔
گارگی۔ منہ اتر گیا ہے۔
اماں۔ اور کیا اِس میں جان ہی کتنی ہے آخر۔
(گارگی اخبار پڑھنے لگتی ہے)
گارگی۔ (یکایک) ہائے ہائے ظلم ہو گیا۔

اماں۔ کیا ہوا بیٹی کوئی کہانی ہے۔
گارگی۔ جی نہیں، کہانی تو نہیں ایک عورت کا قصہ ہے۔ بیچاری کا۔ اکلوتا بیٹا چند دن
ہوئے ٹائیفائیڈ سے مر گیا۔ اُس کے غم میں بیچاری کوئیں میں کود پڑی۔

اماں۔ تو کیا مر گئی۔
گارگی۔ نہیں مر نہیں گئی۔ سپاہی اُسے پکڑ کر عدالت میں لے گئے۔

اماں۔ (ٹھہر کر) عدالت میں کیوں۔
گارگی۔ یہی خودکشی کرنے کی کوشش کے جرم میں۔
اماں۔ بھلا کوئی اپنی جان لینا چاہیے تو اس میں جرم ہی کیا ہے۔
گارگی۔ سرکار اسے جرم قرار دیتی ہے۔
اماں۔ بھلا سرکار کا اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔ یہ آج کی خبر ہوگی۔
گارگی۔ نہیں ہے تو ایک پرانے مقدمے کی خبر۔ آج اُسے بری کر دیا گیا ہے۔

اماں۔ یہ اچھا ہوا . . . . . پھر
اماں۔ گارگی کیوں نہیں سو رہتی کچھ دیر۔ ضد نہ کرو بیٹی۔
گارگی۔ نہیں ماں میں ابھی اخبار دیکھوں گی۔
اماں۔ صبح صبح بری خبریں پڑھ رہی ہے۔ میرا تو جی بھی خراب ہونے لگا ہے۔
گارگی۔ میں کونسی چُن چُن کر بُری خبریں پڑھتی ہوں۔
اماں۔ یہ میں نے کب کہا (اماں پھر ٹہلنے لگتی ہے۔ یکایک گارگی ہنس پڑتی ہے)
اماں۔ (مسکرا کر) باولی ہو گئی ہو کیا۔ ہنسے جا رہی ہو۔
گارگی۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ میں بُری بُری خبریں پڑھتی
ہوں۔ تبھی تو اب میں چُن چُن کر اچھی اچھی خبریں پڑھ رہی ہوں۔
اماں۔ ایسی کونسی ہنسانے والی بات مل گئی۔
گارگی۔ خبر ہے کہ آج کل لاہور میں ایک عجیب طرح کے ڈاکوؤں کا دستہ آیا ہوا ہے

یہ ڈاکو کالجوں کے کچھ لڑکے لڑکیاں ہیں۔ یہ لوگ امیر امیر لوگوں کے گھروں میں جا کر اُن کی موٹریں چلاتے ہیں اور ڈاکے ڈالتے ہیں۔

اماں۔ اچھا (بچے کو تھپک کر کروٹ پر لٹاتی ہے) تو بھلا گارگی یہ ایسا کیوں کر کرتے ہیں۔ انکے ماں باپ انہیں روک سکتے نہیں۔

گارگی۔ (چارپائی سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے) پہلے آپ ادھر لیٹیئے تو میں ابھی بتاتی ہوں (اماں لیٹتی ہے) اصل میں اِن کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دیش میں امیروں اور غریبوں کی حالتوں میں بہت فرق ہے اور یہ فرق زیادہ دیر تک نہیں رہنے پائے گا۔

اماں۔ (حیران ہو کر) بھلا یہ بھی کہیں ہوا ہے امیر امیر ہی رہیں گے اور غریب غریب ہی۔ مال زیادہ کرنے کی بجائے چندہ ہی کیوں نہیں اکٹھا کرنے لگتے یہ لوگ۔

گارگی۔ چندے سے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اور پھر لوگ چندہ دیتے بھی تو نہیں۔ یہ لوگ اپنے کو (RED ASSASIN) کہتے ہیں اور شہر میں انقلاب کرنا چاہتے ہیں۔

اماں۔ دُنیا بہت بدل چکی ہے معلوم ہوتا ہے سبھی پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک تم ہیں کو دیکھو اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے۔ میرا تو دم نکل جاتا ہے ڈر سے (لیٹ کر کروٹ لیتے ہوئے) شام لعل اب ڈاکٹر کو لا ہی رہا ہو گا۔

گارگی۔ آئیں گے تو اِدھر ہی۔ اُن کے جانے کی دیر تھی کہ ننھا سونے لگ گیا۔ اب انہیں منع بھی کیسے کیا جائے۔

اماں۔ آنے دو ڈاکٹر کو۔ کیا جانے ننھا ابھی اُٹھ کر پھر ہلا مچانے لگ جائے۔

(آنکھیں بند کر کے لیٹنا چاہتی ہے) (گارگی اخبار کے ورق اُلٹتی ہے تھوڑی دیر بعد ایک بھکارن گارگی کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

بھکارن۔ (دھیرے سے) بی بی جی

گارگی۔ (اخبار کے اوپر سے دیکھ کر) کیوں کون ہے (بگڑ کر) ارے یہ کدھر چلی آ رہی ہے

ایک منٹ کے لیے کہیں گیٹ کھلا رہ گیا۔ بس سبھی اچھے بُرے سیدھے اندر چلے
آتے ہیں۔ چپ چاپ کیوں کھڑی ہو۔ بولو کیا بات ہے۔
بھکارن۔ بی بی جی کچھ کھانے کو ہو تو دے دیجئے۔ یہیں بیٹھ کر کھا لوں گی۔
گارگی۔ صبح کے نو بجے ہی بھوک ستانے لگی کیا۔ آٹا لینا ہو تو لے جاؤ (ٹھہر کر) یہ تم
کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہی ہو۔ آٹا لو گی یا نہیں۔ خاموش کیوں کھڑی ہو۔
بھکارن۔ دیدو آٹا بھی بی بی جی (رک کر) نہیں تو چار پیسے ہی دیدیجئے۔ تندور سے روٹی
کھا لوں۔
گارگی۔ اچھا ٹھہر و لاتی ہوں (اندر جاتی ہے۔ بھکارن ایک ٹک بچے کی طرف دیکھتی
رہتی ہے۔ اتنے میں گارگی لوٹ آتی ہے، یہ لے پیسے۔ تمہاری شکل دیکھ کر نہ
جانے کیوں ترس آگیا۔ نہیں تو میں بھکاریوں کو کبھی کچھ نہیں دیا کرتی (ایک دوّنی
دیتی ہے) جاؤ (اخبار لے کر پھر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک منٹ کے بعد)
گارگی۔ (غصہ سے) ارے تمہیں کیا ہوا ہے۔ جاتی کیوں نہیں ہو۔ کیا میں نے تمہیں
خرید لیا ہے۔ جاتی ہو یا نہیں۔
اماں۔ (اُٹھ کر) کون ہے گارگی؟
گارگی۔ کوئی نہیں اماں۔ یہ بھکارن مانگنے آئی تھی۔ پیسے بھی دے دیئے ہیں۔ پر جانے کا نام
نہیں لیتی۔
اماں۔ جا ری بھاگ جا۔ بچہ جاگ جائے گا بڑی مشکل سے سلایا ہے۔
(بھکارن سر جھکائے ہلکے ہلکے قدم لیتے ہوئے جاتی ہے)
اماں کروٹ لے کر پھر سو جاتی ہے۔ گارگی اخبار چھوڑ کر اونگھنے لگتی ہے۔
اماں کے گلے سے خراٹے نکلنے لگتے ہیں۔ گارگی کا ایک ہاتھ کرسی پر ہے
اور ایک چھاتی پر۔ آہستہ آہستہ دائیں طرف سے پھر بھکارن کی شکل دکھائی
دیتی ہے، اس کا منہ لال ہے اور بال چوڑے سے ماتھے پر بکھرے ہوئے

دھیرے سے وہ بچے کے کوٹ کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ پاس پہنچکر ایک بار اِدھر اُدھر گھبرا کر دیکھتی ہے۔ اور پھر لپکا یک بچے کو کوٹ میں سے اٹھا کر بھاگنے لگتی ہے۔ اچانک اُس کا پیر اخبار پر پڑ جاتا ہے۔ اماں چونک کر اُٹھ بیٹھتی ہے۔

اماں۔ (دھمکا کر) کون ہے۔

گارگی۔ (سنبھل کر) کیا بات ہے اماں۔

اماں۔ اری ٹھہر تو تُو (بھکارن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہے) اری پکڑ نا گارگی ہیرالال پاپن لئے جا رہی تھی۔

گارگی۔ ٹھہر نگوڑی چکھاتی ہوں تجھے مزا (چلا کر) گنپت! ارے گنپت۔

اماں۔ تم ذرا بچے کو سنبھالو تو میں اِس سے سمجھ لوں (بھکارن کے منہ پر زور سے طمانچہ لگا کر) اب بول۔ چور تھی تو نگوڑی پیسے چراتی (اتنے میں گنپت اور ایک دو دوسرے نوکر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ بھکارن پر گھونسے اور لاتیں برسنے لگتی ہیں۔ دھیرے دھیرے بھکارن دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ سب لوگ اُس کے آس پاس گھیرا ڈال لیتے ہیں۔

ایک نوکر۔ کیسی بھولی بنتی ہے اب۔

گنپت۔ ہوئی کوئی بچے چرانے والی ہو گی۔

ایک نوکر۔ بچے چرانے والے پٹھان اِن عورتوں ہی کو تو پیسے دے دلا کے یہ کام کراتے ہیں۔

جمعدارنی۔ کل اخبار والا بھی تو کچھ کہہ رہا تھا۔ بی بی جی کہ چوروں کا ایک جتھا آیا ہوا ہے لاہور میں۔

جمعدار۔ وہ کیا بچے چرانے والوں کا جتھا ہے۔

جمعدارنی۔ نہیں ہے تو نہیں۔ پر چوری پر آتے تو کیا بچے اور کیا کوئی اور ——

(گارگی اور اماں ہنس پڑتی ہیں)

گارگی ۔ ہٹ پگلی وہ تو کالج کے لڑکے لڑکیاں ہیں ۔ بچّے کیوں چرانے لگیں ۔ پر اماں
یہ ہے کون ۔ بڑی مجھ سے ابھی ابھی دوّنی لیکر گئی تھی ۔

جمعدار ۔ آپ نے دوّنی کیوں دیدی ۔ بی بی جی مٹھی بھر آٹا دیدیا ہوتا نا ۔

گارگی ۔ مجھے کیا معلوم کہتی تھی کچھ پیسے دیدیں تو بازار سے کھانا کھالوں گی ۔

اماں ۔ اِس وقت کھانا کیسا گارگی ۔ کرنا ٹیلیفون پولیس کو ۔

گنپت ۔ یہ تو ایسے بیٹھی ہے جیسے جان ہی نہ ہو ۔

اماں ۔ (بگڑ کر) اب کیوں رہے گا دم بیٹھ تو لے ۔ شام لال کبھی آتا ہی ہوگا ۔ اب
دکھائے دیتی ہوں نگوڑی کو (بچّے کو پکڑ کر منہ چومتی ہے) شور سے کیسا سہم گیا
ہے میرا لال ۔ میرا گڈا ۔

(شام لال داخل ہوتا ہے ۔ گارگی بھاگ کر اُس سے چمٹ جاتی ہے اور
سسکیاں لینے لگتی ہے ۔ شام لال اُسے اپنی باہوں میں لے لیتا ہے)

شام (گھبرا کر) کیا ہوا گارگی ماں کیا ہوا ۔ معاملہ کیا ہے (بھکارن کو بیٹھے دیکھ کر)
ہیں یہ کون عورت بیٹھی ہے ۔

اماں ۔ بیٹا یہ ایک بھکارن ہے ۔ پیسے لینے آئی تھی ۔ ہم دونوں کو سوتا دیکھ کر بچّے کو اٹھا کر
بھاگنے لگی ۔ یہ تو اچھا ہوا میری نیند کھل گئی ۔ نہیں تو یہ ننھے کو لے ہی گئی تھی ۔

شام ۔ ننھے کو ؟ کیا یہ بچّے چرانے والی ہے ؟

اماں ۔ جانے کون ہے ڈائن کہیں کی ۔ اسے پولیس کے حوالے کردو ۔

(شام لال گارگی کو چارپائی پر بٹھا کر دھیرے دھیرے بھکارن کے پاس
جاتا ہے)

شام ۔ (بھکارن کا ہاتھ پکڑ کر) ہیں یہ تو مری پڑی ہے ۔

اماں ۔ ہائیں مری پڑی ہے کیا سچ مچ (خوف سے) دیکھا تم کتنے پاپل ہیں ۔ رام

شاہم۔ گھنٹی دبا کر ٹیلیفون پر پولیس انسپکٹر کو بلاتا۔

(بائیں دروازے سے جمعدار ایک سپاہی کو لیکر داخل ہوتا ہے)

جمعدار۔ حضور یہ کانسٹیبل چوراہے پہ کھڑا تھا اسے بلا لایا ہوں۔

شاہم۔ (کانسٹیبل سے) دیکھنا میرے خیال میں تو یہ عورت اب چل بسی۔

کانسٹیبل۔ (عورت کو ہلاتے ہوئے) حضور اس میں تو بالکل جان نہیں ہے۔ اب تو ایک ایمبولینس بلوا دیجئے! اسے تھانے لے چلیں گے (عورت کو ٹٹول کر) ارے یہ تو وہی عورت ہے جسے آج صبح عدالت نے بری کیا تھا۔

شاہم۔ یہ حراست میں تھی کیا۔

کانسٹیبل۔ جی نہیں حضور (آہ بھر کر) بیچاری قسمت کی ماری کوئی غریب عورت تھی خودکشی کرنا چاہتی تھی۔

شاہم۔ (حیران ہو کر) خودکشی کیوں۔

کانسٹیبل۔ حضور داستان لمبی ہے۔ اس کا بچہ مر گیا تھا۔ بس پاگل پن کی حالت میں کوئیں میں کود پڑی۔

گارگی۔ (ڈر کر) پر یہ خبر تو آج اخبار میں بھی تھی۔

اماں۔ وہی خبر جو تم سنا رہی تھیں۔

شاہم۔ (رک کر) تو اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں رہا۔

کانسٹیبل۔ جی نہیں سرکار میرے خیال میں یہ اکیلی ہے۔ بچے کے خیال میں . . . . .

شاہم۔ وہ اس کی جیب دیکھو کچھ ابھری ہوئی ہے۔

کانسٹیبل۔ شاید کچھ چھپا لیا ہوگا (رحم سے) بیچاری کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔

(دھیرے سے جا کر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ جیب میں سے چیں چیں کرتی ہوئی ایک ربڑ کی گڑیا نکلتی ہے)

پردہ گرتا ہے

شانتا کیرتن
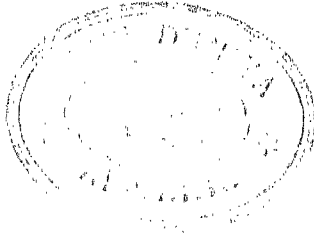
گجراتی ادب کے ترقی پسند رجحانات

کشمیر کے نازک پوس پہاڑوں ہیں، وہاں کے خوبصورت سبزہ زاروں ہیں، اونچے اونچے دیوداروں ہیں، ایک ایسی کشش ہے جو انسان کو آج کا کام کل پر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر گجرات کشمیر سے کہیں زیادہ کاروباری ملک ہے۔ لیکن پھر بھی وہاں کے لوگوں میں کبھی نہ کسی طرح یہی عادت پائی جاتی ہے۔ اس بات کا پتہ ہمیں اس وقت چلتا ہے جب ہم اس علاقہ کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ہم اسے اس نظر سے دیکھتے ہیں جس سے گویا یہ زندگی سے متعلق غور طلب مگر ایک تنقیدی باب ہے۔ ان گجراتی ادیبوں نے پھولوں کی تعریف ضرور کی ہے، چاندنی کا آنند ضرور اٹھایا ہے لیکن جیسے ہی انہوں نے زندگی کے آنگن میں پیر رکھا ویسے ہی اپنے فطری اضطراب کی وجہ سے (ESCAPISM) کی طرف سر پر پیر رکھ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کے مزدور بھائیوں کی آواز ان کے لئے بہت کرخت ہے، اس سے دور بھاگ کر انہوں نے [illegible] رالکے

دل کو سکھ پہنچانے والے چھپے اور ندیوں کی خاموش گنگناہٹ میں پناہ لی ہے ہے لیکن اس تغیر پسند دنیا نے ہزاروں برسوں کے خوابوں کو توڑ دیا ہے۔ انہیں بھی اس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے

گجراتی بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۴۰ لاکھ ہے۔ گجراتی سرحد شمال میں سروہی اور مارواڑ تک اور جنوب میں تھانا ضلع تک پھیلی ہوئی ہے۔ گجراتی تمدن کا کچھ اثر سندھ کے کسی کسی حصّے میں بھی ظاہر ہے۔ کاٹھیاواڑ تو اس کا ہمیشہ ایک مخصوص حصّہ رہا ہے سچ بات تو یہ ہے کہ گجراتیوں کی ایک بڑی تعداد دنیا کے ہر حصّے میں دکھائی دیتی ہے اور کوی کھردار کے الفاظ میں "جہاں ایک گجراتی رہتا ہے وہاں ہمیشہ گجرات ہے" اس لیے گجراتیوں کے زیادہ تر بیوپاری ہونے کی وجہ سے گجراتی زبان پر دوسری زبانوں کا بہت اثر پڑا ہے اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ گجراتی زبان کافی لچکدار ہو گئی ہے۔ گجراتی بیوپاریوں میں کوئی کوئی ادیب بھی مل جاتا ہے۔ اس زبان نے جتنے فارسی اور عربی لفظ ہضم کیے ہیں اتنے اور کسی جنوبی زبان نے نہیں کیے۔ ہندی اور گجراتی میں بہت قریب کا تعلق ہے۔ دونوں کا جنم ایک ہی قدرتی زبان راجستھانی یعنی سوریسینی سے ہوا ہے۔ پریم چند کی قریب قریب تمام چیزوں کا گجراتی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور انہوں نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔

سمت ۱۲۹۶ سے لیکر سمت ۱۴۳۰ کا زمانہ گجراتی ادب میں انتشار کا زمانہ تھا۔ پرانی گجراتی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ایک طرف درباری شاعر پدم ناتھ وغیرہ اپنی کویتاؤں سے راجہ مہاراجوں کی خوشامد کر رہے تھے اور دوسری طرف راس اور لگن گیتوں کے ذریعے عوام کا مذاق ظاہر ہو رہا تھا جنتا نے اس قسم کے ادب کی آج تک حفاظت کی ہے وہ اب بھی گاتی ہے۔

جاؤں چھیو، جاؤں چھوڑے گوری
جاوانی کھیپرے، جاوانی کھیپرے

دے دے جو ہیٹے تے سنگا دھی

مبن ہے اُس سے تھوڑا بہت فرق پڑا ہو۔ یہ اُس وقت کے عمومی مذاق کی
تصویر ہے۔ ایسی خوبصورتی کے رس میں ڈوبی ہوئی کہانیاں برہمچاری جین سادھوؤں
نے سنائی تھیں اور معتقد بھائیوں نے سنی تھیں۔ یہ کہانیاں اجنتا اور ایلورا کی یادگاریں
ہیں۔ خیر، جین سادھوؤں نے ان کہانیوں کو کبھی کبھی اپنے مذہب کو پھیلانے اور دوسرے
سادھوؤں پر کامیاب حملے کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ اُس وقت برہمنوں کا بہت اثر تھا۔
جین مذہب نے ذات پات کی زنجیریں ڈھیلی کیں۔ جین دھرم بیوپاریوں کے عروج کا
عکس تھا۔ اس نئے مذہب میں شامل ہونے والوں میں طوائفوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شُودروں
کو چھوٹی ریاستوں میں ہونے والی سامنت شاہی لڑائیوں سے بہت بغض تھا جو کاروبار
میں رکاوٹ ڈالتی تھیں اور جان مال کو بالکل غیر محفوظ بنا دیتی تھیں۔ اُنہیں ویدک یگیہ
وغیرہ پر بھی کوئی خاص اعتقاد نہ تھا۔ اور ہو بھی کیوں؟ برہمنوں کی دکشنا کا خرچ عوام
پر بھاری بھاری قرض لادنے ہی سے تو پورا ہو سکتا تھا۔ کسان اسے سہہ نہ سکے اور نیچے
کی کہانی برہمنوں کی مخالفت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ایک مرتبہ ایک آوارہ برہمن چماروں کے دیش میں گیا۔ وہ اُجین کا رہنے والا تھا
اور اُس کا نام ادھورشیدھر تھا۔ راستے میں اُس کی چوروں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ برہمن
نے کہا میں سنیاسی کا بھیس بناؤں گا۔ تم گاؤں والوں کے سامنے میری تعریف کیا کرو۔
پھر ہم مل کر انہیں لوٹیں گے۔ چوروں نے مان لیا۔ برہمن بیراگی بن کر ایک جنگل میں جا کر
بیٹھا۔ اُس جنگل کے قریب دیوادیں تین گاؤں تھے۔ چوروں نے گاؤں والوں سے
کہنا شروع کیا کہ یہ برہمن بڑا مہاتما ہے۔ ایک مہینے سے یہ آب و دانہ روزہ رکھا ہوا
ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لوگوں کا برہمن پر اعتقاد ہو گیا اور وہ اُسے پوچھنے لگے۔ گھر پر کھانے
کے لئے بلا کر تمام پوشیدہ باتوں اور روپے پیسے کے انتظام میں اُس کی صلاح لینے
لگے۔ برہمن نے ہر گھر کا بھید جان لیا۔ رات کے وقت دوسرے چوروں کے ساتھ اُس

گھر پر حملہ کرتا تھا۔ ایک دن ایک چور پکڑا گیا اور اسے بے حد مار پڑی۔ اس نے گھبرا کر ساری قلعی کھول دی۔ دوسرے سب چوروں کو پھانسی دی گئی۔ لیکن برہمن تو بیراگی بن کر بیٹھا تھا۔ اسے کیسے مارتے؟ اسے گاؤں سے باہر بھگا دیا گیا۔ دھوکا دینے والا برہمن دنیا میں اپنی بدنامی کی شرم سے چھپتا چھپاتا کر مر گیا اور نرک میں گیا۔ مطلب یہ کہ جو دوسروں کو پھنسانے کی کوشش کرتا ہے اس کا کبھی بھلا نہیں ہوتا۔

۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک پورانک ادب زوروں پر رہا۔ اس کے بعد شارشریہ ادیب اپنا کام کرنے لگا۔ اس زمانے میں جیتے جاگتے انسانوں کو چھوڑ کر پورانک کرداروں کے ذریعے لوگ اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ اس نقل میں بھی خلوص اور زبان کی خوبصورتی موجود تھی، لیکن زندہ خون کی وہ گرمی نہ تھی اُن انسانوں کے سکھ دکھ کا عکس ہی تھا بھگتی کا پرچار ہو رہا تھا۔ رات کے وقت گوپیوں کے گھر چھوڑ کر کرشن کے پیچھے بھاگنے پر رس بھرے گیت بنائے گئے۔ یہ گیت اُن عورتوں کے دل میں جن کے شوہر سال کا بڑا حصہ کاروبار اور سفروں میں گزارتے تھے، گھر کر چکے تھے، لیکن اس دور نے کوئی آگے لے چلنے والا ادیب پیدا نہ کیا۔

اس گمراہی میں اگر کسی نے مشعل جلایا تو وہ اردا بھگت نے ہی جلایا ہے (۱۶۱۵ء - ۱۶۷۴ء) اُس نے اپنی صحیح اور زوردار طرز ادا میں کچھ کھری کھری باتیں وشنوؤں کو سنا دیں۔ وہ احمد آباد کے سنار تھے۔ اور کچھ عرصہ تک وہاں کے شاہی ٹکسال کے نگران بھی رہے تھے۔ دنیا پر انہیں یقین نہ تھا۔ اور اس سے اکتا کر انہوں نے سنیاس کی راہ اختیار کی۔ دُنیا سے بھگت بنی بھاگے تو پھرتے تھے۔ مگر اس کے ظلم سے وہ ناواقف نہ تھے منہ پر رام اور بغل میں چھری والے وشنوؤں کے ساتھ وہ متفق نہ ہو سکے۔ دھرم گورو کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ——— "گورو تو بن کر بیٹھے ہیں مگر پتھر گلے میں باندھ کر وہ تیر کیسے سکیں گے؟"

اسی ظلم سے وہ ایک اور حملہ کرتے ہیں۔ دیوتاؤں کو ماننے والوں کی وہ بے فکری

سے مذاق اڑاتے ہیں :-

"کافی بیوقوف ایسے ہیں جنہیں جتنے پتھر ملیں، اُن کو دیوتا ماننے کی عادت پڑی ہوئی ہے"

ورن آشرم بھی اُن کی تیز نظر سے چھوٹ نہیں سکا، وہ کہتے ہیں —— "جب وہ بڈھے ہو جاتے ہیں، روپے پیسے کھو بیٹھتے ہیں تو اُنہیں حق اور دھرم کا خیال آتا ہے"

کتھا پوران سے بھی وہ شردھا کھو بیٹھتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

"کچھ لوگ ایسے ہیں، جو مردہ لوگوں کو دکھا کر اپنا بھلا کرنا چاہتے ہیں، بھلا شراپ کسی کا کیا بھلا بُرا کر سکتا ہے؟"

بھگت جی کو پاکھنڈ سے نفرت تھی، کاروباری بھگتی سے پریم نہ تھا۔ اُن کے اشعار آج کل کے نوجوانوں کا من بھی اُکسا دیتے ہیں۔

اُن کے بعد تو گجرات میں لوٹ مار کا زمانہ آگیا، یہ ملک مغل اور مرہٹہ حملہ آوروں کے چنگل سے چھوٹ نہ سکا۔ کوی گجراتی فارسی میں جو اُس وقت درباری زبان تھی، اور پنجابی میں شعر کہتے تھے لیکن کوئی ترقی پسند ادیب نظر نہیں آتا۔

۱۸۳۳ء میں گجراتی ادب کے اُفق پر ایک اور درخشاں ستارے کا ظہور ہوا۔ اس وقت تک انگریزی نے اپنا عمل دخل کر لیا تھا۔ اور گجرات مغربی ادب کے قریب آ رہا تھا۔ شیلے، ورڈز ورتھ وغیرہ اپنا اثر جما رہے تھے۔ اس شانتی کے زمانے میں کاروبار بھی بڑھنے لگا تھا، ساتھ ساتھ قومیت کے بیج بھی بوئے گئے۔ نرمد اس زمانے کی صدائے بازگشت ہے۔ اس کشمکش کا رہبر ہے۔ وہ رومانیت سے چھوٹ نہیں سکا مگر پھر بھی اپنے زمانے سے چند قدم آگے ضرور بڑھ گیا تھا۔ اُن دنوں پہلی بار گجراتی میں ایک روزانہ اخبار "بمبئی سماچار" جاری کیا گیا۔ نرمد نے بمبئی میں ایک نئی سبھا قائم کی۔ اُسے گجرات پر بڑا فخر تھا۔ مگر اس فخر کو قومی تعصب سمجھنا بھول ہے۔ اُس نے لو بیاہ اور ودھوا ادواہ کے لئے بہت کوشش کی اور اس طرح سماج کا ایک اصلاح کار بن

گیا۔ اُس نے ملک کو سندیش دیا کہ "آگے بڑھو، آگے بڑھو اور جنگ جیتو۔" اُس نے ڈھنڈورا پیٹا کہ جنگ کی شہنائی بج رہی ہے بہادرو، آگے بڑھو اور جنگ میں کود پڑو۔ کیونکہ وجے مالا تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ ہمت کے سہارے کولمبس نے نئی دُنیا دیکھی، دلیر بہادرو، ذات پات کی زنجیریں توڑو اور دیس پردیس میں گھومو۔

اپنی نظم اور نثر کے ذریعے اُس نے کئی طرح کی پریشانیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے نئی گجراتی کی شروعات ہی اُس سے ہوتی ہے۔ اُس نے گجراتی ادب میں مضامین، ادب اور تنقیدی مقالے داخل کئے اور اپنے عمل کے لئے اُس نے مندرجہ ذیل پروگرام بنایا۔

۱۔ "مغربی تہذیب کا پھیلانا۔
۲۔ دیسی کارخانوں اور مزدوروں کو اُٹھانا۔ اُن کی حوصلہ افزائی کرنا۔
۳۔ اپنے حقوق کو سمجھنا اور سرکار کے آگے اُس کی مانگ پیش کرنا۔
۴۔ ملک کی جسمانی اور معاشرتی حالت کو سدھارنا۔
۵۔ آزادی کے لئے لڑنا۔
۶۔ نرا کار پر ماتما کو ماننا۔
۷۔ بت پرستی اور پہنتوں کی مخالفت کرنا۔
۸۔ فرقہ داری کو دور کرکے ملک میں اتحاد پیدا کرنا۔

نرسداشنکر کے بعد مختلف قسم کے ادبی رجحانات پیدا ہوتے۔ آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اور گجرات اپنے سے اونچی معاشرت کے زیر اثر آگیا تھا اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایسے موقع پر گڑبڑی مچ جائے۔ نرسدا نے کہہ دیا تھا کہ انگریزوں کے بدلے فرانسیسیوں کی فتح ہو جاتی تو ہندو دھرم کا نام و نشان مٹ جاتا فرانسیسی انگریزوں سے زیادہ ملنسار ہیں۔ ہم اُن سے زیادہ ملتے اور زیادہ اُن کی نقل کرتے۔ اِس گڑبڑ سے گھبرا کر ادیب پھر پُرانی تہذیب کے گُن گانے لگے۔ اور پُرانے

سامنت شاہی زمانے کو سنہری زمانہ کہنے لگے اور صدیوں پیچھے بھاگنے کی فضول کوشش کرنے لگے۔ کانگرس قائم ہو چکی تھی۔ اور نوجوان جاگ رہے تھے ستیہ گرہ نے لوگوں کو جگایا اور اس کشمکش کا گجراتی ادب پر ایک غیر فانی اثر رہ گیا " ہزاروں دیشنی جوئی ویدنا او نے ہنڈا اٹھایا تھا" اور "گھائل مرتاں مرتاں رسے مانتی" وغیرہ آزادی کے گیت گائے جاتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ گجرات کی قوم پرستی نے کوئی دوسرا پریم چند پیدا نہیں کیا۔ رمن لال ڈیسائی کا ایک ناول قوم پرستی کا اچھا نمونہ ہے۔ مگر کہاں ہیں وہ پریم چند جی کے غریب کسان، کہاں ہیں وہ مہینے میں پانچ دس روپے کمانے والے کارکن اور چپراسی؟ گجرات میں سرمایہ داروں کا زیادہ زور ہے۔ ادب بھی لکھ پتی لاکھوں اور بڑے بڑے افسروں سے دبے ہوئے غریبوں کا ترجمان ہے۔ رام نرائن کا ناول "پچاس سال کے بعد" اور اُن کی چھوٹی کہانیاں اُس کا ثبوت ہیں۔ کنہیا لال منشی لکھ رہے تھے ——— "میں زندگی کی سچائی کو مانتا ہوں۔ زندگی کو باندھنے والے قاعدوں کو نہیں" لیکن وہ ممبئی حکومت کے محکمہ انصاف و تحفظ کے پریسیڈنٹ تھے اور جن ہاتھوں سے مزدوروں پر گولی چلانے کا حکم لکھا گیا تھا اُن ہاتھوں سے لکھے ہوئے ان الفاظ کی چمک ماند پڑتی جاتی ہے۔ ترقی پسند ادب کے پڑھنے کا شوق اب بڑھتا جا رہا ہے اور ایک دن وہ آئے گا جب چندر بھائی اور نیرو دلیبائی جیسے ناول نگاروں کو قبول عام حاصل ہو گا۔

کاٹھیاواڑ کے لوگ گیتوں کسان گیتوں اور کہانیوں میں عام لوگوں کی خواہشات چھپی ہوئی ہیں۔ اُن میں سرمایہ داری کے خلاف احتجاج ہے۔ اور کسانوں سے ہمدردی۔

اب تو ملک کی آنکھیں کھل گئی ہیں، ادبی ذوق دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ ادب میں نئی نئی شاخیں نکل رہی ہیں یہ "ہندوستانی" خواہ ملکی زبان ہو یا نہ ہو۔ لیکن جو صوبائی زبانیں ہیں۔ اُن کی ترقی رک نہیں سکتی۔ نظم میں سانیٹ آزاد بحر کی نظموں وغیرہ

نے کچھ کامیابی حاصل کی ہے۔ میگھانی نے دکھیوں کا دکھ اپنے گیتوں میں سنایا۔ اُنہوں نے "مصیبت زدہ لوگوں کے گیت" اور "آخر یہ زہر کھا لے" وغیرہ گیتوں میں شاعر سے پوچھا ہے کہ لاکھوں لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ اس وقت تجھے غروب آفتاب اور پھولوں کی تعریف کیسے سوجھتی ہے؟"

"میل منڈل" کے ارکان نے بھی اس ترقی پسندی میں ساتھ دیا ہے۔ اور چند دن پہلے "آگ گاڑی" میں گاڑی کے مزدوروں سے ہنستے بولتے ہیں اور اپنی ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ڈرامہ گجراتی ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔ موجودہ گجراتی ادب کے دلدادہ اُماشنکر جوشی سے بھی ناواقف نہیں ہیں، اُن کی نظمیں لوگوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں، وہ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہے جس نے لکھا ہے "امرن"

ابھی تک ہم لوگ ادب کی چوٹی پر نہیں پہنچے ہیں لیکن ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مستقبل میں بھی یہ مقام ہماری پہنچ سے باہر ہی رہے گا۔

سہیل عظیم آبادی

الاؤ

گاؤں سے پورب ایک بڑا سا میدان ہے کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چورس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اُسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اُس کے بعد کھیت۔ اُتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے۔ اس کے بیچ میں کوئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اُس کے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ اُس کے پاس ہی ایک کنواں اور اُس کے بعد ایک کھیت۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڈھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈالدیا جاتا تھا جس کی مہک دُور دُور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر میں سیر کیا

کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا۔ بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائیگا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں، پرجا ہی پرجا ــــــ راجہ کو مرے برباد ہوتے تو زمانہ بیت گیا، اس کا راج محل تو میدان ہے۔

یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ دو کھ پیڑتے کولہو بٹھاتے اور کولہو سار بناتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی۔ اور میدان میں کٹنکی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔

کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھروں کو لیجا رہی تھیں۔ بھگو الوپ کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی کو سینک کر سیدھی کر رہا تھا۔ ابھی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی بیچ کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی۔ اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

بھگو نے لاٹھی سیدھی کرنے کو الاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سینک کر پیپل کی جھپڑ میں پھنسا کر آہستے سیدھا کرتا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سروں میں گاتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں بہت باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہئے۔ ٹھیک ویسی ہی، یا اس سے بڑی جیسی اس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی۔ اور اس سبھا

ہیں وہ کھڑا ہو کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھاتے۔ جیسے وہاں ایک آدمی تھا۔

بھگوا اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اکلو آگیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اور گاؤں کے ناطے میں بھگوا کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا۔

"بیٹا! لاٹھی تو اچھی ہے مگر اس میں گرا سا لگے تب۔

بھگوا نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔

"ہاں چچا۔ پر گرا سا اچھا سا مل جائے تب نا۔"

شام ہو چکی تھی، دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی کیا ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے کھڑا کر کے دفعتا پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے۔ اور اگر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ سامو اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آگئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا۔

"ارے بھیا! ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے۔"

اکلو بولا۔

"بھگوا اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی۔"

باڑھو بولا۔

"مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی۔"

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا، اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ سالول اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے بیٹھ بھی گئے تاپنے۔"

باڑھو بولا۔

ہاں بٹیا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم نے ٹو کا کب تھا۔ ایسے ایسے ہی راج ... ہی بول رہا تھا"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی۔ اس لئے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے"

ساتول نے کہا۔

کیا چچا، ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی"

باڑھو بولا۔

"نہیں تم سب کی بات نہیں یہی تو میرا کہنا ہے تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے سننے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھو ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ چھپی اور چھیدو کے دونوں لڑکے ریڈ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح بھک بھک کھینچ کر دھواں اڑا رہے ہیں۔ ڈانٹا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگ گئے۔ سب کا کلیجہ جل جائیگا"

اتنے میں چھپی آ گیا، اور باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرا دی لیکن چھپی نے کہا۔

"بھیا۔ اب اوچا نا ہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک کا قصہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے ہم میدان سے آ رہے تھے میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دیکھا، پتو کالا کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے۔ جانے دو ریتو۔ تو ریتو کہتا ہے ایسے نہیں بھوجی۔ ویسے کہو۔ جیسے

موری راہ چھوڑ دو گردھاری دیر ہوئی

یاد ہے کرشن لیلا والا گانا جب اس نے پلٹی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی اچھل دوں گی تو

راستے سے بھاگا۔"

"کچا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہوگا ـــــ" جانتے ہی ہو ریتو کیسا ہنسوڑ ہے۔"

لیکن چھپی نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"ہش! یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہم نے دیکھا تھا۔ کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔"

ساؤل چپ ہو گیا۔ اور باڑھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا۔ لیکن سامو نے بیچ ہی میں روک کر کہا۔

"ارے بھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں سنا ہے دھرمپور میں بڑی بڑی سبھا ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی۔"

بھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے باقی سب کاٹھ کے الو ہیں۔ پھر بولا۔

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔"

ساؤل بولا۔

"بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگ پر جتنا ظلم ہوتا ہے اُسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔"

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی، اس لئے باڑھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہو گیا اور بولا۔

"بات تو ٹھیک ہے، پر ہونا مشکل ہے نا؟"

بھاگو بولا۔

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے بس! دھرمپور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے۔"

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آ گئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور تیس برس سے گاؤں میں کرگھہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا ٹھریا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا الگ رکھ کر ایک دم لگایا۔ اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لئے تیار ہو لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب چپ ہو گئے جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔

"ارے سب چپ ہو گئے، بات کیا تھی؟"

سانول نے جواب دیا۔

"پھاگو دھرمپور گیا تھا طوفانی چچا۔ وہیں کی بات تھی۔"

"کیا بات تھی؟"

طوفانی میاں نے اس انداز میں سوال کیا جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں سب کا سننا بے کار ہوا۔ پھاگو نے پھر سے ساری بات دہرا دی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے۔"

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ چھکو تیلی نے کہا۔

"طوفانی میاں نے سولہ آنہ ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی

کو ٹیا چھوٹا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا ——"
چھٹو دھوبی نے اور آگے بڑھ کر داد دی اور کہا۔
"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے۔ سب جمیندار ہو جائیں تو پھر کھیتی کون کرے گا؟"

دلو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا یہ سب کی باتیں سن کر اُس کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن اُس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آ کر اُس کے ہونٹوں پر رک جاتی تھی۔ لیکن اب اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس نے کہا۔
"اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے"
طوفانی میاں نے اور اُن کے ساتھ دوسروں نے اُس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت۔ چین جاپان اور امریکہ سے آیا ہوا مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اُس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اُس نے کہا۔
"ہم لوگ کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا"
ساؤل نے کہا۔
"ٹھیک کہتے ہو دلو ——"

طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے۔
"سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماغ کھراب ہو جاتا ہے" اُس کے ساتھ ہی چھٹو اور چھکو اور ایک دو آدمی اُٹھ کر چلے گئے۔ اور اس انداز سے جیسے اُس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے لیکن اِن لوگوں کو اِس کی پرواہ نہ ہوئی۔ بلکہ ساؤل نے کہا۔
"ظلم پر ظلم ہے۔ پرسوں ہی کی بات ہے، میگھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے میگھو کی عورت آ کر اُن کا چوکا کرے اور اُس نے انکار کر دیا۔"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل منگیو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔"

"دلو نے رائے پیش کی۔ اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پہ بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پرواہ ہو کر یہی فیصلہ کیا کہ پٹواری جی کو رسیدانہ نہ دیا جاتے۔ دبا و ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں۔ وہ بھی بند۔ اور بیگاری آخری طور پر ختم ——"

"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔ سانول نے کہا۔

"تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا۔

پکا بات ہے بھائی۔ مرد بات سے نہیں پلٹتا"

پھاگو نے کہا —— بالکل ٹھیک"

پھر سنتل بولا:-

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا۔ کہتے تھے کہ تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگریس کرے گی"

سنتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگریس کی برائیاں وہ سن چکا تھا۔ اُس نے کہا۔

"دلو بھائی —— کانگریس —— مولانا صاحب تو کہتے تھے ——"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا۔

"دھت۔ یہ سب بکتے ہیں۔ گریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا۔ اپنے کرنا ہوگا جو ہو"

یہ کہتے ہوئے دلو اُٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا۔ اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اُٹھتے ہی سب کے سب اُٹھ گئے۔

دوسرے دن سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پر کہتے پھرتے تھے "آج سبھا ہوگی" بچے تماشہ سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجے پر غور کر رہے تھے۔ کہ بھس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر مہتوں اور طوطا رام کو بلا کر خوب ڈانٹا۔ گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے لگان باقی نہیں کہہ دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اُٹھا کر نہ لے جاسکے گا ——— اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہوئے مگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے سبھا کرنے والوں کو سخت غصّہ ہوا۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے۔ اور سب سے کہا۔ "سب کا حشر طوطا رام اور اندر مہتوں کا ہوگا۔ تم سب چڑیوں کی ٹولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤگے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ۔

صبح اُٹھ کر سانول منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیادے نے آکر کہا۔

"سانول بھائی۔ تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے"

سانول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور لیکن وہ چور نہیں تھا، جو منہ چھپاتا، منہ ہاتھ دھو کر اُس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اُسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کرنا چاہئے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا، پھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے پھاگو نے سانول کو دیکھتے ہی کہا۔

"بھیّا جانتے ہو کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہیں ——— کیا رائے ہے ———"

سانول نے جواب دیا۔

"چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے"

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھاگو نے یہ بھی بتایا کہ اُن کی ساری باتیں

پٹواری کے کانوں تک چھٹو دھوبی پہنچاتا ہے۔ اس سے سانول کو بڑا غصّہ آیا اور وہ بولا۔
"دو سالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کھوج کھود کھود کر بات پوچھتا ہے۔ اور اپنے باپ دادا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی!"
دلو نے کہا۔
"غصّہ کرنے کی بات نہیں سانول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا ——"
سانول نے کہا۔
"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہیئے"
بھاگو نے پوچھا۔
"تو اب کیا ہوگا؟"
سانول نے کہا۔
"ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو، پٹواری نے بلایا ہے، وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"
سانول چلا گیا۔ دلو اور بھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ اُن دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی لیکن ان دونوں نے سانول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصّہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں اُس کو غصّہ آجاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رُکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن بھاگو نے کہا۔
"دلو بھائی سانول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے۔ تو سانول بھیّا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں"
دلو نے ایک لمبی سانس کے ساتھ کہا۔
"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائیگا"
بھاگو بولا "پھر بھی . . . ."

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ ساون تیزی کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ ساون آگیا۔ اور آتے ہی بولا۔

"بھاگو لاٹھی تو دے ــــــ"

دلو اور بھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے ساون کو سمجھایا۔ مگر وہ تنتا جا رہا تھا ــــــ اُس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا، بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے بھاٹک بند کروا دیا۔ اور چاہتا تھا کہ مارپیٹ کرے، مگر وہ اُس طرف کی دیوار کو جو نیچی ہے، پھاند کر بھاگ آیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ جھبٹو اور جھیبی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں۔ اور وہ اِن دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا۔ اُس نے ساون کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ بھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ بھاگو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا پھر بولا۔

"اب کیا ہوگا دلو بھائی؟"

دلو بولا۔

"دیکھا جائے گا ــــــ"

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آگئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ ساون چلا گیا۔ لیکن جب کچھ جوان آدمی آئے تو ان سے بولا۔

"بولو اب کیا ارادہ ہے۔ اب عزت چاہتے ہو یا ذلت؟"

ذلت کون چاہتا ہے۔ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے لیکن دلو نے سب

کو سمجھا دیا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ صرف اب کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر سانول کو پوچھنے آئے۔ دلو نے کہہ دیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن جھبی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے۔ اور ان دونوں نے اس کو کمرے میں بند کر دیا ہے جھبی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات باتیں میں کہہ دیا کہ جھبی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اُسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اُس کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے اُس نے تن کر کہا۔

"تم اُسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ۔"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر اُن کی ہمت نہ پڑی، اُن میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہیے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔"

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اُڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلا رہے ہیں۔ کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے ـــــــ اور اُن کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور اور دوسری طرف عزت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ اُن کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے والوں کی سزا، سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے تو زمیندار انہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں کس وقت کیا کام کرنا چاہئے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی۔ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اُٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے کان بھرے اور بہکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ سانول، دلو اور رہا گو کے ساتھ کئی آدمیوں کو دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس مل گیا۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور نہ کچہری کی طرف ——— گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جا سکے۔ وہاں کھلیان تھا۔

سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آ گئے۔ اور ان پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی لیکن آگ جو سلگی تھی، وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی۔

سانول صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے جھبی آتا ہوا دکھائی پڑا۔ سانول ٹھہر گیا۔ جھبی جیسے ہی پاس آیا۔ سانول بولا۔

"تم کو ہم سب سے بیر کا ہے کا جھبی بھائی۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ تم بھی کسان ہو" جھبی بولا۔

"تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو———"

سانول کو اس کا یہ کہنا دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا۔

"دیکھو چھیبی بھائی، یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو۔ اسی پٹواری نے
ہم کو مارا تھا۔ بات ذراسی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے ——— اپنی
بے عزتی بھی بھول گئے"
چھیبی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بولا۔
"بیکار بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں"
ساونل نے کہا۔
"یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے"
لیکن ساونل اس بات کو بھول گیا تھا کہ بھاگو کا باپ گاؤں کا پاہل تھا۔ اور اسی
زمانے میں بہت سا کھیت چھیبی سے لے کر زمیندار نے بھاگو کے باپ کو دیدیا تھا۔ اس
سے اُس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت پُرانی ہو چکی تھی چھیبی نے کہا۔
"سنو ساونل! تم بیچ میں نہ پڑو۔ بھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر۔۔۔"
"یہ بات بڑی پُرانی ہو چکی اسے بھول جاؤ۔ یا کہو تو بھاگو سے کہہ کر تمہارا کھیت
دلوادوں ——— لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے بابا ڈھو چاچا نے تو لیا نہیں۔ لیا تو تھا
زمیندار ہی نے قصور کس کا ہے"؟
مگر چھیبی پہ ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ اُس نے کہا۔
"ساونل میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ———"
"سب ٹھیک۔ پر یہ تو بتاؤ۔ اُس دن تم پیادے کیوں لائے تھے۔ ان کو کیوں
بتایا تھا کہ ساونل بھاگو کے گھر پہ ہے میرے باپ نے تو تمہارا کھیت نہیں لیا تھا"
چھیبی کھسیا گیا۔ اور اُس نے کہا۔
"مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں"
وہ دو قدم آگے بڑھا۔ لیکن ساونل نے اس کا راستہ روک لیا۔ اور ذرا تیکھا ہو کر بولا۔
"سنو چھیبی بھائی۔ تمہیں جواب دینا ہوگا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں

یہ تمہارے حق میں بڑا بُرا ہو گا۔
جھبیی جانتا تھا کہ ساتول غصیل آدمی ہے۔ اِس لئے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ بھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا۔ وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اُس کا بگاڑا نہیں تھا۔ اور وہ صرف اپنے فائدے کے لئے گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا۔ مگر اب بُرے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ ساتول کو جواب دیئے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اُس نے کہا۔
"ساتول دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں کام ہے راستہ چھوڑ دو۔"
اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید جھبیی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا۔ مگر راستہ کے لئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف راکھ کے گھنے کھیت تھے جن میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی ساتول نے راستہ نہ دیا تو جھبیی نے چاہا کہ اُس کو ہٹا کر چلا جائے ـــــ لیکن ساتول نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جھبیی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا۔
"لڑنا چاہتے ہو کیا؟"
ساتول بولا
"ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس کی ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے۔ ہم تو تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔"
جھبیی کو غصہ آچکا تھا۔ اُس نے کہا۔
"کہا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا ـــــ"
ساتول کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جھبیی کے منہ سے نکلی ہی تھی۔ کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اُس نے جھبیی کے سر پر

سے مارا جھیبی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا۔ اور وہ چکرا کر گر گیا۔
بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شنکا رخود ہی پھنس گیا۔ پولس آئی اور سانول گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہیئے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے مندر اور دھرمسالے بنا کر۔ اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہیئے۔
ایک طرف سانول کا مقدمہ کھلا، دوسری طرف دلو اور بھاگو اور دوسرے کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا غلہ کھلیان میں آ گیا تو اُن سب پر جن پر کسی طرح کا شک تھا۔ دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس کی تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے۔ زمینداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا۔۔۔۔۔
آخر اس طرح کب تک چلتا۔ لوگ اُکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں۔ اِس لئے چپ رہنا ہی بہتر۔ لیکن چپ رہیں تو کب تک۔ دلّو نے بھاگو کو ایک دن بلا کر کہا۔
"اب کچھ کرنا چاہئے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔"
بھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا۔ اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اٹھے دوسرے گاؤں میں چلے کئے جائیں۔ اور اسی پر عمل بھی کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اُس کا اثر پڑ سکتا تھا۔ سر جوڑ کر بیٹھے۔ اور سر پہ آنے والی آفت سے بچنے کی ترکیب سوچنے لگے بات بڑھتی گئی اور اُس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ رام دھنی بھی ایک کسان تھا۔ جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ جب سانول کی ضمانت نہیں

کے اندر گھس گیا۔ اُس نے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اور میری
ے ملائم پیٹ کی سلوٹوں پر جا پڑیں جیسے پوچھنے والے کی انگلی رومال
ے بہترین الفاظ پر جا پڑے بے صبر ہاتھ اوپر بڑھا۔ اور اُس کے سینے
تے طائر انگلیوں میں دبوچ لیئے گئے۔ اُس کے چہرے پر ایک سانولا
تا، بیہ خال تمنا کا حُسن، میرا مرعوب ہاتھ واپس آ گیا، اور دُنیا پہلے کی سی
منٹ ہم سڑک کو دیکھتے رہے جو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زندگی کی مانند
رہی تھی، اور آتے جاتے ٹانگوں، موٹروں، لاریوں کو۔

کیسی چیز ہے؟" میں نے اپنے دوست سے انگریزی میں پوچھا، جو ٹانگے والا
دونوں نہیں سمجھتے تھے۔

'امول' میرے دوست نے پرجوش جواب دیا۔ اس بات نے مجھے محظوظ کر دیا۔
ے زمانہ سلطنت کا جنگلی اپنی قوم سے اپنی حسین مغویہ کی تعریف سُن کر خوش ہوا ہوگا۔
ن یہ سوال کیسے اُٹھا؟

ظاہر تھا کہ میرے دوست نے ٹانگے کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ میں ہمارے بیچ
کہانی کا کوئی حصہ نہیں سُنا تھا۔ زندگی نہایت پُرشور ہے۔

یہ رات تو نہیں ٹھیریگی، میں نے گویا قدرتِ کامل سے انکار کر دیا۔ لیکن اگر منظور ہو
ایک دو گھنٹے کے لیئے ٹھیرا لیتے ہیں۔

"تمہیں یقین ہے؟ اسے نہیں تھا۔

"بندۂ خدا، میں نے اس کے برہنہ سینے کو، پیٹ کو، ناف کو، قمیص کے اندر سے
چھوا ہے، اس کے سینے کو چھو لینے سے موت کا ساقتہ آ جاتا ہے"

"یہ سب کچھ ہو چکا ہے؟ اس کی متجسّر حرص نے پوچھا، ہم اسے کہاں لے جائینگے؟"
"کسی ہوٹل میں، میں نے جواب دیا۔ گویا ایسے واقعات میری زندگی میں بچوں کی
طرح کثیر تھے۔ اس دوران میں وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتی رہی۔ انجان، لیکن غالباً

سب کچھ سمجھتی ہوئی۔

"تو لے چلو"

کیا میں اسے بازاری بات نہیں بنا رہا؟ میرے دل نے دھتکارا۔ مگر یہ انکار کر سکتی ہے۔ اور میں اس پہ فدا ہو جاؤں گا اگر اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اس کے چہرے کو تاکا اور اس کے سینے کے طائروں پر میری آنکھیں گڑ گئیں۔

"تم شام کو جا سکتی ہو" میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"نہیں میں ڈیڑھ بجے کی لاری پہ چلی جاؤں گی"

سہ پہر کی لاری سے چلے جانا" بلی" میں نے لاڈ سے کہا۔

ہمارے گاؤں کو صرف ایک ہی لاری جاتی ہے اور وہ ڈیڑھ بجے چھوٹ جاتی ہے" اس نے کہا۔

اب تو ساڑھے بارہ بج گئے ہیں" میں نے کہا۔ اس میں صرف پندرہ منٹ کا جھوٹ تھا۔

"تو وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ تو وقت بھی ایک آدھ گھنٹہ اس کا انتظار کر سکتا ہے میری آنکھوں میں اس کی قدر بڑھ گئی۔ گو بات چھوٹی سی تھی۔

ہمارا ٹانگہ بڑے آدمی کی کوٹھی کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اور لاریوں کا اڈا تو اس سے بھی پہلے گذر چکا تھا۔ ٹانگے والے نے کہیں بھی کھڑا ہونے کو نہ پوچھا۔ گویا اسے ہم دونوں میں کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ہمیں ابد تک عشق و محبت کی باتیں کرنے کے لئے ٹانگے میں لئے پھرنا چاہتا ہے۔

ایک ہوٹل کے سامنے میں نے ٹانگے کو ٹھہرا لیا۔ ٹانگے والا پیسے لیکر رخصت ہوا اور ہم تینوں اندر چلے گئے۔ ہم نے چوبیس گھنٹے کے لئے ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور دوست کو میں نے بڑے آدمی کی طرف روانہ کر دیا۔

قدیمی رفقا کی طرح ہم دونوں پلنگ پر اکٹھے لیٹ گئے۔ جب بوس و کنار کا پہلا دور

ختم ہو چکا تو اُس نے کہا 'لو' دروازہ بند ہی نہیں کیا' چھوڑو' دروازہ بند کر آؤں' ایک لمحے کے بعد وہ میری بے صبر باہوں میں پھر آ گئی۔

'ختم کرو قصہ اب' اُس نے کہا۔ مجھے شام کو واپس گھر پہنچنا ہے۔

'دوکانداروں کی طرح بات کرتی ہو' میں نے کھسیانہ سا ہو کر کہا۔ میں تو تم پہ فدا ہوں اور آج رات نہیں جانے دوں گا۔

'نہیں' تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے' اُس نے جمپر کو اتارتے ہوئے کہا۔

'کرتا ہوں'

'نہیں'

'کیوں؟'

'میں اس لائق نہیں'

'تو کیا تم پیسے کی خاطر۔۔۔' میں نے کہا اور جواب کے لئے اپنے کو تیار کر لیا۔

'شاید'

'کیا مطلب؟'

اس نے باہنہ سے آنکھیں ڈھانپ لیں میں نے اُس کی باہنہ اُٹھائی تو وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

'روتی کیوں ہو؟'

'تم نہایت اچھے ہو'

'تمہیں کون بُرا کہتا ہے؟ یہاں کوئی کہانی ہے' بتا دو' اور میں نے اسے ایک پُرجوش بوسہ دیا۔ جیسے ایک بوسے میں میں اُس کے دُکھ کو گندی جونک کی طرح چوس سکتا تھا۔

'میں یہ بات ہمیشہ نہیں کرتی۔ سال میں ایک دو مہینے کے لئے جب میکے آتی ہوں۔ میرا خاوند صاحب عزت ہے۔ اگر اسے پتہ لگ جائے تو مجھے گھر سے نکال دے

"تمہارا خاوند کیا کام کرتا ہے؟" میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔
"زمیندار[1] ہے" اُس نے جواب دیا، "اور کافی خوشحال، میں یہ اپنے ماں باپ کی خاطر کرتی ہوں، وہ بہت غریب ہیں" وہ عورت کی فطرتی طویل کلامی سے کام لینے لگی، "دونو بہت بوڑھے ہیں اور میرے باپ کو دمہ کی بیماری ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ بھائی کوئی نہیں، ایک آٹھ سال کی چھوٹی بہن ہے میں ہی اُن کا ایک سہارا ہوں، میرا خاوند کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں"
"اور تم اس طریقہ سے اُن کی مدد کرتی ہو" میں بے قرار ہو رہا تھا۔
"سال میں ایک دو مہینے ان کے ہاں ٹھیرتی ہوں اور قریباً ڈیڑھ دو سو روپیہ انہیں کما دیتی ہوں جس پر اُن کا سال بھر کا گذارہ چل جاتا ہے۔"
"کتنے سال سے ایسا کر رہی ہو؟" میری بیقراری کم ہو گئی تھی۔ اب میں اُس کی کہانی میں کھویا جاتا تھا۔
"یہ دوسرا سال ہے، میرے باپ کو بیمار پڑے چھ سال ہو چکے ہیں، اُن کے پاس پانچ گھماؤں زمین تھی۔ جواب بک چکی ہے۔ آخری ٹکڑے کو بکے دو سال ہو چکے ہیں"
وہ ہچکیاں بھر رہی تھی جن سے اُس کی چھاتیاں ہل رہی تھیں میں اُس کی بیقراری دیکھ رہا تھا، اُس کا سر میری بانہہ پر رکھا تھا اور میری آنکھیں اُسکے چہرے پر۔
"روؤ نہیں" میں نے بوسہ دیکر کہا۔
اُس نے آنسوؤں سے تر رخسار کو پونچھا۔
"گاؤں کے لوگ کیا خیال کرتے ہونگے؟" میں نے پوچھا۔
"انہیں کچھ خبر نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں اپنے خاوند کے روپے چرا کر اپنے ماں باپ کو دیتی ہوں، کاش میں ایسا کر سکتی، مگر میرا خاوند بہت سخت اور ہوشیار ہے"

---

[1] پنجاب میں ہر مالک کسان کاشتکار زمیندار کہلاتا ہے۔ یوپی کا زمیندار نہ سمجھا جائے۔

'ان غیر حاضریوں سے کسی کو شک نہیں ہوتا؟ تمہیں کئی دفعہ شہر کو آنا پڑتا ہوگا۔'
'ہاں ہیں گاؤں میں کچھ نہیں کرتی۔ ہر دوسرے تیسرے روز میں اپنے باپ کے لئے دوا لینے شہر آتی ہوں' وغیرہ وغیرہ'
'اور جب تم رات کو گھر نہیں جاتیں؟ اس دفعہ کی طرح؟'
'کوئی اتنا زیادہ خیال نہیں کرتا'
'پھر بھی ہمسایوں کو تو شک گزرتا ہوگا'
'ہمارے ہمسائے بہت اچھے ہیں' وہ ایسے شک نہیں کرتے۔ اور ہماری شہر میں رشتہ داری جو ہے' وہ تھوڑا سا مسکرائی۔ شاید اسے ٹانگے پر چڑھنے کا وقت یاد آ گیا تھا
میں نے اُسے باہوں میں بھینچ لیا۔ محبت کی رو سی میرے بدن میں سے گزر رہی تھی۔

'تیرے خاوند کو شک نہیں گزرتا؟ اس کے خیال میں تیرے ماں باپ کی کون مدد کرتا ہے؟ اسے مدد کرنی چاہیئے' مجھے اُس کے خاوند سے نفرت ہو رہی تھی۔
'پتہ نہیں' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی کسی مذہبی رسم کی ادائیگی میں کسی سوال کا جواب دینے سے چوک جائے۔ شاید اس کا خیال ہو کہ ابھی اُن کے پاس زمین کا روپیہ جمع ہے۔
'لیکن ایک نہ ایک دن اسے پتہ لگ جائے گا'
'ہو سکتا ہے' یہ ایک بات تھی جسے سوچنے سے وہ جھجکتی تھی۔

میں تمہیں پیسے دے دیتا ہوں' اور میں نے ایک پانچ روپے کا نوٹ بٹوے سے نکال دیا۔
اس نے نوٹ لے لیا، مگر پوچھا 'تم جھجکتے کیوں ہو۔ مجھ سے کوئی بیماری ہو جانے کا خطرہ ہے؟'

'نہیں، ایسا تو کوئی ڈر نہیں'

'میری کہانی سن کر تمہیں مجھ سے نفرت ہو گئی ہے۔ ایک منٹ پہلے تمہیں مجھ سے محبت تھی۔ آدمی کیسے عجیب ہوتے ہیں؟ اُس کے لہجے میں ایک ناراضگی تھی میں اپنے غریب ماں باپ کو اور کیسے کھلاؤں؟ اگر میں لڑکا ہوتی تو فوج میں بھرتی ہو جاتی۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

ایسے حقیقی محبت سے میں نے اُس کے منہ کو چوما۔ ایک نوٹ پانچ روپے کا اُسے اور دے کر کہا: یہ میرے دوست کا حصہ ہے، اب جاؤ۔ اور کم از کم دو آدمیوں سے تو اپنے کو بچا لو۔

ہم ہوٹل سے نکل کر بازار میں آ گئے۔ اور ایک ٹانگہ بلا لیا۔ جب وہ ٹانگے میں بیٹھ گئی تو میں نے کہا: وعدہ کرو کہ اب سیدھی گھر چلی جاؤ گی'

'ہاں' وعدہ۔ اگر لاری چلی بھی گئی ہو گی تو ریل میں جاؤں گی، گو اس حالت میں مجھے تین میل سے زیادہ چلنا پڑے گا۔

میں نے اُس کے منسکار کا پیار بھرا جواب دیا: "اگر میں لڑکا ہوتی تو فوج میں بھرتی ہو جاتی" میرے کانوں میں ایک نعرے کی طرح یہ الفاظ گونج رہے تھے ؎

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں — لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے — اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے

اک مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں — اُن کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی چھوڑ دوں

ہاں مناسب ہے، یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں — میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں

زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں — اِس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

عیش و دولت کے مظاہر ہیں نظر کے سامنے سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے

سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لیکے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں

کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں

تختِ سلطاں کیا ہے سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سلام مچھلی شہری

قلی

سر سے بوجھ اتار کر ساتھ چھوڑتے ہوئے
اِک ذلیل کی طرح ہاتھ جوڑتے ہوئے
وہ بہت ادب سے جب دام مانگنے لگا
میرا دل غرور اور برہمی سے بھر گیا
کیوں نحیف و نیم جاں کیڑے کو مسل نہ دوں
کیوں ذلیل و بدنصیب کتے کو کچل نہ دوں
بزدلی و بےحسی، مفلسی کے روپ میں
اِک ذلیل جانور آدمی کے روپ میں
جرأت اتنی بھی نہیں بڑھ کے شاخ موڑ لے
اپنی محنتوں کا پھل، مسکرا کے توڑ لے

خاموش رہو!

اب پاؤں بھر آتا ہے — اچھے! وہ یکہ آتا ہے

خاموش رہو . . . . !

لاچار ہوں، دکھیا ہوں بابو! — دو روٹی سے بھوکا ہوں بابو!

خاموش رہو . . . . !

اندھے کی خبر لے لو بابا! — اللہ کی خاطر دو بابا!!

خاموش رہو . . . . !

رمال کی بابو حاجت ہے؟ — دو آنے اس کی قیمت ہے!

خاموش رہو . . . . !

سرکار! یہ بھاری بوجھا ہے — اک آنہ اس کا تھوڑا ہے

خاموش رہو . . !

کیا چھوٹے ہے بابا! جانے دو! — مندر میں پھول چڑھانے دو!

خاموش رہو . . . !

"کملا کا خط"

"میرے من کے دیوتا! بندگی قبول ہو! — اپنے پیارے گاؤں کی دکھشی قبول ہو!

پھر بسنت آ گئی، پھر بہار آ گئی — ڈالیوں پہ آم کے پھر نکھار آ گئی

جیسے بستے رہے ہو تم میرے دل کی ہوک میں — جیسے بولتے ہو تم کوئلوں کی کوک میں

"سوچ سوچ کر تجھے گیت گاتے ہونگے وہ" — رادھا کہہ رہی تھی کل "اب تو آتے ہونگے وہ!"

آؤ میرے دیوتا! جی بہت اداس ہے — خوش تو ہوں بہت مگر دل تمہارے پاس ہے!

ہاں، بھول ہی گئی کل سپاہی آیا تھا — منشی کے کہہ رہا تھا کچھ رعب بھی جمایا تھا

میں نے کہہ دیا کہ "آج تو معاف کیجیے — آئے ہیں بمبئی سے ان کو آنے دیجیے!"

اور آگے کیا لکھوں بات ہی کوئی نہیں — دن ہیں آشا کے بہت رات ہی کوئی نہیں!"

حسن نذیر

وہ رات

رات سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ تاریکی کپکپا رہی تھی۔ ستارے بادلوں کا لحاف اوڑھ کر اوجھل ہو چکے تھے۔

گرجا کے گھڑیال پر دو بجے۔

ایک لمحہ کیلئے فضا لرز اٹھی اور گھڑیال کی ٹن ٹن لہراتی ہوئی دور تک خاموشی پر چھا گئی۔ چوکیدار نے آگ کے سامنے سے اپنا تمتماتا ہوا چہرہ اٹھاتے کہا "یہاں مسافر کے لئے جگہ نہیں بابو۔ مجھے دروازے بند کرنا ہیں۔"

اجنبی آگ سے دور ہٹ گیا۔ بغیر کچھ کہے وہ اپنی ایڑی پر گھوما اور گرجا کے احاطے کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اس کے سامنے دور تک والی روڈ کے قمقموں کی قطار کسی بہت پرانی مالا کے منکوں کی طرح دمکتی ہوئی رات کے اندھیارے میں گم ہو رہی تھی۔ کولتار کی سڑکوں کی شفاف سطح پر جگہ بہ جگہ سراب نما چمک جھلملا رہی تھی۔ ہر چیز بے جان تھی اداس

اور خاموش! راہگذار پر اِکّے دُکّے آدمی کسی نامعلوم منزل کے مکینوں کی طرح بھٹکتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر دور و یہ درختوں کی بے برگ و بار شاخیں کسی نامعلوم خوف سے تھرتھرا رہی تھیں اور خشک ٹنڈ کسی گہری سوچ کسی ابدی فکر میں کھوتے ہوئے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ ارد گرد آسودہ حال اور متمول لوگوں کے بنگلے تاریکی میں لپٹے پڑے تھے۔ دور تک کہیں زندگی کا نشان نہ تھا، سوائے اُن اِکّے دُکّے بے منزل راہگیروں کے!

اور آہستہ آہستہ وہ بھی گم ہو گئے، گویا یہ رات کو چلنے والے کسی وہم کے زیرِ اثر چلتے چلتے تاریکی کے کسی گہرے غاروں کو وکر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ وہ اجنبی جس کی کوئی منزل نہ تھی زندگی کے اندھیارے میں ٹٹول ٹٹول کر اپنی منزل کی تلاش میں ایک بے قابو مشین کی طرح چلتا رہا، چند لمحوں کے لئے ایک غالب اور مکمل سناٹا اُس کے گرد و پیش چھا گیا۔ اُس کے اپنے قدموں کی چاپ اُسے ایسی دل کش اور بھلی معلوم ہوئی کہ وہ اُس کے زیر و بم اور موسیقی میں گم ہو کر ہر چیز کو بھول گیا۔ وہ چلتا رہا یہ بھول کر کہ وہ تین دن سے بھوکا ہے اور برف و باراں کے آنے والے طوفان سے پناہ لینے کے لئے اُسے کسی جائے پناہ کی تلاش ہے۔

یکایک ہوا کے ایک سرد اور تیز جھونکے نے اُسے چونکا دیا۔ سڑکوں کے دونوں طرف خشک، زرد، مرجھائے ہوئے پتوں کے انبار میں ایک کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ پتے اڑ اڑ کر اُس کے جسم کو چھوتے اور فضا میں رقص کرتے ہوئے ایک سمت سے دوسری طرف جانے لگے۔ اُس نے سوچا شاید یہ زندگی کا رقص ہے، زرد، خشک، پژمردہ اور بے معنی! اور اُس کی لڑکھڑاتی ہوئی چال زندگی کے اسی رقص کا ایک جزو ہے لیکن وہ چلا جا رہا تھا، ایک بے قابو مشین کی طرح کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں! اُس کی ٹانگیں بھوک اور نقاہت کی شدت سے لڑکھڑا رہی تھیں، وہ اپنے جسم کو گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کی ایڑیاں زمین سے رگڑتی ہوئی چل رہی تھیں۔

سڑک کے دوسری طرف قمقموں کی قطار کے اُس پار تاریکی میں اُسے ایک گہرا اور تاریک تر سایہ حرکت کرتا ہوا معلوم ہوا، وہ ٹھٹک گیا اور ٹٹول کر اُس نے بجلی کے ایک کھمبے کو تھام لیا، جس کی روشنی کسی وجہ سے گل ہو چکی تھی۔ سایہ تیزی سے اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور بھاری بھرکم بوٹ کی ٹھپ ٹھپ قریب ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں سے آواز آئی "تم کون ہو؟ اس وقت کہاں آوارہ پھر رہے ہو؟ لیکن اُس اجنبی راہگیر نے کچھ جواب نہ دیا۔ آواز اور قریب سے آئی۔

"بولتے کیوں نہیں؟ تم کون ہو ایسی رات میں آوارہ پھرنے والے!" اجنبی اب بھی خاموش رہا لیکن وہ بے اختیار لڑکھڑایا اور اُس نے مضبوطی سے کھمبے کو تھام لیا۔ کانسٹیبل نے اُس کے شانے کو سختی سے جھنجھوڑا اور درشت لہجے میں کہا "شرابی بدمعاش کیا منہ تک رہا ہے۔ بولتا کیوں نہیں" ——— لیکن جواب میں خاموشی کی بجائے اب کے اُسے ایک بے اختیار قہقہہ سننا پڑا۔ وہ قہقہہ جس میں زہر کی تلخی اور موت کی افسردگی ملی ہوئی تھی ایک لمحہ کے لئے فضا کو چیرتا ہوا آسمانوں کی طرف اڑ گیا۔ کانسٹیبل نے محسوس کیا کہ وہ ہنسی ایک ہولناک چیخ تھی، جس نے رات کے سکوت کو پاش پاش کر دیا۔ اُس نے سوچا پاگل اور شرابی یوں نہیں ہنسا کرتے لیکن خیال کی تردید کرتے ہوئے اُس نے اجنبی کو شانہ سے ہلایا۔ اور کرخت لہجہ میں کہا "شرابی بدمعاش ہنستا ہے۔" اجنبی نے کچھ کہے بغیر تین بار اپنے پیٹ کو ہاتھ سے تھپکا۔ اور ایک پُرمعنی اشارے سے ہاتھ اپنے ہونٹوں کی طرف اٹھا دیا۔ کانسٹیبل نے کہا "پھر بھی تم مجرم ہو ———

آوارہ گرد، شرابی . . . . دو جرم ہیں تمہارے . . . . میں مچلکہ لکھوں گا"

اب اجنبی نے زبان کھولی "بے شک دو جرم ہیں میرے . . . . غلامی اور بیکاری . . تم مچلکہ لکھو" اور یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر زور سے اپنے پیٹ کو تھپکا۔ کانسٹیبل کو معاً اُس کی ہنسی کا خیال آیا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے غور سے وہ سر سے پاؤں تک دیکھا، ایک لمحہ سکوت کے بعد وہ بولا "جاؤ، بابو جاؤ"

یہاں سے۔ ۔ ۔" یہ کہہ کر وہ لوٹا اور اپنے بھاری بھرکم بوٹوں کی دھپ دھپ سمیت تاریکی میں غائب ہو گیا۔

سکو ندی کے پل پر آ کر وہ رُکا۔ ارد گرد دور تک گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی پہاڑی نالے کا پانی ڈھلوان پر گزرتا ہوا اِس طرح معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چاندی کے پترے آبنوس کے وسیع تختے میں جڑ دیئے گئے ہوں۔ پھر شمال کی طرف سے آنے والی ہوا میں لمبے سانس کھینچ کر اُس نے چوراہے کے درمیان تختی پر لکھے ہوئے سڑکوں کے نام پڑھے یہ ہے موریل ز ُواک۔ ۔ ۔ شاید کسی انگریز میجر کی چہیتی لڑکی کے نام سے موسوم۔ ۔ ۔ یہ ہے آرچیر روڈ کسی بہت بڑے انجینیر کے نام سے منسوب جس کی زیرِ نگرانی یہ سڑک تعمیر ہوئی ہوگی، کون کہہ سکتا ہے اُس انجینیر نے غریب مزدوروں اور ملکی ٹھیکہ داروں کا گلہ کاٹ کر سمندر پار کے بنکوں میں کتنی دولت جمع کی ہوگی، یہ ہے نڈیمی روڈ کسی غیر معروف ہستی کے نام کی نسبت سے صدیوں سے غلامی کا پٹہ لکھوائے ہوئے اور وہ سوچنے لگا کہ زمین کے چپہ چپہ پر کتنے ہی غیر معروف، گمنام لوگوں کے نام کندہ ہیں لیکن ان لمبی سڑکوں کے گرد و پیش، یا اُن کی حدود سے باہر، ملک کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک پناہ گزیں ہونے کے لئے اُسے ایک گز بھر زمین تک نصیب نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
غیض و غضب سے اُس کا خون کھولنے لگا۔ اور اُس کے کانوں میں ایک مبہم، نامعلوم مہمل سا شور بڑھنے لگا۔ جیسے بے شمار انسانوں کی ملی جلی چیخیں آہ و پکار، درد و کرب کا غل کسی ہجوم میں سے اُٹھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہجوم جو دیوانہ وار اپنے ماحول کو پاش پاش کرنے کے لئے اودھم مچا رہا ہو۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ رگوں میں خون اُبلنے لگا۔ ندی کا شور پتھروں سے ٹکرا کر برابر غل مچائے جا رہا تھا، ندی کے شور کے ساتھ ساتھ اُس کے اعصاب کا ہیجان لمحہ بہ لمحہ تیز ہونے لگا ——— اُس کی نگاہ تل بار دیکھنے لگے اپنے انہیں سڑکوں پر فوجی دستے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے پھرنے

مشین گنیں، چھاؤنی سے شہر کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

سڑک پر سامنے ایک موٹر کار آہستہ آہستہ بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے اپنا رخ پھیر کر دیکھا۔ اگلی نشست پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ کار کی روشنی میں اس کے آویزوں کے سرخ نگینے کانوں کے نیچے لہرا رہے تھے۔ خون کے قطروں کی طرح جو ہوا میں اڑتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں دمک اٹھیں۔ بالکل خون کے قطروں کی طرح۔ . . . موٹر گذر گئی اور پھر وہی مکمل سناٹا رات پر طاری ہو گیا۔ سڑکیں خالی پڑی تھیں اور اسے خیال آیا۔ چند لمحہ پیشتر اس کی روح پر ایک بے پناہ شور چھا رہا تھا۔ وہ اس کی رگوں کا کھولتا ہوا خون تھا، یا ندی کا شور، یا مستقبل کے کسی ہنگامہ کا ایک ٹکڑا ــــــ؟ وہ یہ معلوم نہ کر سکا اور بغیر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کئے وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ بادل کے ایک ہلکے سے پردے کے پس پشت، سرو کے تاریک درختوں کے جھنڈ کے عین اوپر پورا چاند نمودار ہوا۔ گندھک کے دھوئیں کی طرح زرد، بالکل ایک چپاتی کی مانند جو گیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے توے پر پڑی پڑی پیلی ہو گئی ہو۔

ہوا پھر تیزی سے چلنے لگی اور کہیں کہیں درختوں کی برہنہ شاخوں میں سے سیٹیاں بجاتی ہوئی، چیختی ہوئی گذرنے لگی، وہ دیر تک چلتا رہا، اس کی روح میں ایک خلا پیدا ہونے لگا۔ لیکن اس کی فطرت کے کسی پُراسرار گوشے سے سیٹیوں اور چیخوں کا شور ابھرنے لگا۔ یکایک ہوا دم سادھ کر رک گئی۔ فضا پھر ساکت ہو گئی۔ گہری موت کی سی خاموشی ہر چیز پر مسلط ہو گئی۔ ندی کا شور آہستہ آہستہ دور بھاگ گیا۔ وسیع سناٹے کے ساتھ فضا میں گہری دھند چھا گئی۔ زمین پر روئی کی سی سفید سفید پھوئیاں برسنے لگیں۔ برف کے گالے لڑھک لڑھک کر اس کے کانوں، آنکھوں اور ناک کے پاس سے گذر کر اس کے پاؤں پر پڑنے لگے۔

(۳)

وہ سڑکوں پر چلتا رہا، چنار کے بلند برہنہ درختوں کی قطاروں کے بیچ، ایش کی

ڈی بینڈی ٹہنیوں کی پناہ میں اور بے برگ و بار شہتوت کی قطاروں کے ساتھ ساتھ ایک سائے کی طرح ۔۔۔ سڑکوں کے دونوں طرف فوجی افسروں کے بنگلے تاریکی میں سوئے پڑے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ کمرے کی کھڑکی کے شیشے سبز یا نیلی روشنی میں مدھم سی چمک دے رہے تھے۔ زمین پر سفید سی چادر بچھ چکی تھی۔ سرو کے درختوں کی سیاہی سپیدی میں تبدیل ہو گئی اور مور پنکھی کے جوڑے چپٹے پتوں پر بے شمار بگلے بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ سوکھے ہوئے بے جان درختوں کی شاخیں چاندی کی بنی ہوئی نظر آنے لگیں، سارا منظر یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے کسی نے چند لمحوں کے اندر اندر ہر چیز پر چونا پھیر دیا ہو۔ یا پگھلی ہوئی چاندی ہر چیز پر جما دی ہو۔ اس کے اپنے کانوں اور کندھوں پر برف کے گالے اٹک گئے تھے اور اُس کے پاؤں شدتِ سرما سے سُن ہو رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں ایک بنگلے کی کھڑکی کے چھجے کے نیچے آ کر رکا۔ چھجے پر سے پانی ٹپاٹپ گر رہا تھا اور کھڑکی کے شیشے ہلکی نیلی سی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ شیشے کے اُس طرف ریشمی پردوں پر رنگا رنگ نقش و نگار اس کی بے سر و سامانی پر مسکرا رہے تھے۔ اُس نے سوچا دیوار کے اُس طرف سنجاب و سمور کا پُر تکلف بستر اور اس پر عشاق کا ہنگامِ تپاک ۔۔۔ لفظ، جملے اور فقرے آہستہ آہستہ اُس کے کانوں میں پڑنے لگے۔ جملوں کے ساتھ بے لفظ آوازیں اور ان آوازوں میں جذبات کی دُنیا آباد، دھیمی اور دبی دبی سرگوشیوں میں بے لفظ معانی ۔۔۔ کتنے شبستانوں کی راحت اُن سرگوشیوں میں پوشیدہ تھی، کیسی ملائمت تھی، کتنا سکون تھا ۔۔۔ وہ بے اختیار وہاں سے بھاگ نکلا۔ جیسے وہ الفاظ، وہ آوازیں، وہ بے لفظ سرگوشیاں، اور وہ دبے دبے قہقہے اس کی روح کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے اور وہ اُن جملوں کی راحت کی تاب نہ لا کر دیوانہ وار دیوار سے ٹکرا کر سر پھوڑ دے گا۔ وہ بے اختیار بھاگ نکلا۔ اپنے ثباتِ ذہنی کے لئے اپنی تابانی کو محفوظ کرنے کے لئے اپنی روح کو زندگی کے دو پہلوؤں کے

بچانے کے لئے وہ بے اختیار بھاگ نکلا اور شبستان کے دریچے میں ریشمی پردے کے نقش و نگار اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتے رہے۔ وہ دیر تک ان قہقہوں کی آوازیں اپنے عقب میں سُنتا رہا۔

(۴)

دُور بہت دُور سڑکوں کی سطح سے کسی قدر نیچے کہیں آگ کا چھوٹا سا ڈھیر ٹمٹما رہا تھا۔ وہ تیزی سے بڑھتا رہا۔ سڑکوں پر برف کی تہیں جمی ہُوئی تھیں وہ اپنے بوٹ کی ٹوٹی ہوئی نوک سے ان چادروں کو چاک کرتا ہُوا گذرنے لگا۔ برف کی وسیع سپیدی پر سیاہی کی ایک لکیر رینگتی ہوئی اُس کا تعاقب کرنے لگی۔ ایک امٹ لکیر، خطرناک، بدشگون تاریک! جو برابر اُس کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ وہ جس طرف رُخ بدلتا سیاہی چکر کاٹتی ہُوئی اُس کے پاؤں پر آ رہتی۔ وہ ایک بار سڑک کے موڑ پر رک کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ لیکن ایک سائے کی طرح وہ لکیر اس کے پاؤں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس تعاقب سے رہائی ناممکن تھی۔ ایک تیز، شدید احساس اس کے اندر بڑھنے لگا۔ جیسے وہ کسی نامعلوم تاریک جرم کا ارتکاب کر چکا ہو۔ اور ایک پُراسرار انتقام اس کے عقب میں بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ ایسا انتقام جس سے گریز ممکن نہیں، ہرگز ممکن نہیں — لیکن وہ جرم کیا تھا۔ جس کی پاداش میں تاریکی اس کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ لحظہ بہ لحظہ اُس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ کوئی چیز گہری اور پُراسرار اُس کے نفسِ لاشعور کی تہ سے اُبھر رہی تھی اور آہستہ آہستہ شعور و فہم کی حد پر بھٹکنے لگی۔ لیکن وہ اب بھی معلوم نہ کر سکا کہ اُس کے مبہم جرم کی نوعیت کیا تھی! پھر اس نے ایسا محسوس کیا۔ گویا کوئی چیز اُس کی رُوح کی گہرائیوں سے اُبھر کر اس کے جسم کی حد سے باہر کود پڑی ہے اور لپک کر اس کا گلا دبانا چاہتی ہے۔ کوئی چیز اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ناقابلِ لمس تاریکی کا ایک مینار، بھیانک اور کرخت اس کے گلے کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہُوا — یکایک اُس نے مقابلے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔

وہ سڑک کے موڑ پر کھڑا اپنے عقب میں برف پر اپنے پاؤں کے نشانات کی سیاہ لکیر دیکھ رہا تھا (وہی تعاقب، وہی ہولناک انتقام، وہی سیاہی کی بدشگون لکیر — گھبرا کر وہ بھاگنے لگا اور بھاگتے بھاگتے اس نے اپنے کانوں میں بیشمار مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز سنی مسلسل اور متواترا اور اس بھنبھناہٹ کے درمیان کہیں سے ایک آواز اٹھ رہی تھی "زندگی اس پستی میں گذارتے ہو، نفسیاتی پستی میں، غلامی اور افلاس میں! اس جمود سے موت بہتر ہے۔ جاگو جاگو تمہاری روح سو رہی ہے، مردہ ہے، تمہارے جمود کا انتقام لیا جائے گا۔ تمہاری نسلوں سے انتقام لیا جائے گا، بھوک اور غلامی اور افلاس" — بھاگتے بھاگتے اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ لیکن دور تک خاموشی چھائی ہوئی تھی، کوئی بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا، پھر اس نے ڈرتے ہوئے ایک نگاہ اپنے پیچھے ڈالی۔ وہی پراسرار انتقام اس کے تعاقب میں بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہی سیاہی کی لکیر اس کے اچھلتے ہوئے پاؤں کے ساتھ کھچی چلی آ رہی تھی، بھاگی چلی آ رہی تھی۔

———— (۵) ————

بوڑھے گداگر نے اپنی لکڑی کی ٹانگ سکیڑتے ہوئے کہا "آؤ بابو، آگ تاپو۔ اس پل کے نیچے ہوا بہت کم پڑتی ہے، دور تک ایسی کوئی جگہ نہیں۔ رات یہیں پڑے رہو" یہ کہتے ہوئے اس نے انگاروں پر لکڑی کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال دیئے۔ تھوڑی ہی دیر میں آگ بھڑک اٹھی۔ شعلے لپکنے لگے اور پل کی شمالی دیوار پر دو سائے رقص کرنے لگے۔ ایک ہلکا سا رقص، بالکل یوں جیسے متحرک پانی میں عکس تھرتھراتا ہے! بوڑھے کی داڑھی پر اپلے پڑے ہوئے تھے۔ سر کے بال میل کی وجہ سے رسی کی طرح بل کھائے ہوئے تھے اور اتنے بڑھ گئے تھے کہ اس کی ٹوپی کے اندر پوری طرح سما نہیں سکتے تھے اس لئے چند لٹیں دونوں طرف کنپٹیوں پر لٹک رہی تھیں۔ کہیں کہیں ان بالوں کی لٹوں سے پانی ٹپک ٹپک کر خشک ہو گیا تھا، اس کے ماتھے اور رخساروں پر سے میل دھل کر بہہ گئی تھی اور جابجا ہلکی سفید سی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس کے چپٹے چہرے پر

اس کی پچکی ہوئی ناک مٹی کے اس لوٹے کی ٹونٹی کی طرح معلوم ہوتی تھی جس میں اس نے برف ڈالی ہوئی تھی اور پگھلا کر پانی بنانے کے لئے آگ کے قریب ہی دھرا تھا میلی کچیلی کالی بھوؤں کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پتلیاں نہایت سکون سے آگ کے انگاروں پر جمی ہوئی تھیں، ایک لمبا سا لٹھ، جسے وہ بغل میں دبا کر چلتا ہوگا۔ آگ کے قریب ہی رکھا تھا۔ بوڑھے کی داہنی ٹانگ گھٹنے سے نیچے لکڑی کی بنی تھی۔ بائیں پاؤں میں ایک پرانا پھٹا ہوا کپڑے اور ربڑ کا جوتا تھا۔ لیکن اب اس نے وہ بھی اتار کر سوکھنے کے لئے آگ کے قریب رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر اس اجنبی نے اپنے چمڑے کے گھسے ہوئے سوراخ والے بوٹ اتار ڈالے اور بوڑھے کے جوتے کے ساتھ ہی اپنے بوٹ کے دونوں پاؤں ڈال دیئے تین بوٹ! ایک کا کینوس پھٹ چکا تھا، لیکن تلوے کی ربڑ اب تک سلامت تھی، چمڑے کے بوٹوں کے ساتھ ہی یہ حقیر چیز بڑی بھی، غریب، قلاش، بوڑھے گداگر کا بوٹ جو برف و باراں میں بیکار محض تھا۔ لیکن چمڑے کے بوٹ کی جوڑی! اس میں تو کوئی خاص نقص نہ تھا۔ صرف پنجوں کے قریب چمڑا پھٹ چکا تھا۔ اور تلووں میں بھی کچھ زیادہ سوراخ نہ تھے۔ دونوں میں صرف ایک ایک سوراخ، بائیں پاؤں میں تین انچ لمبا اور دو انچ چوڑا اور دائیں کے تلوے میں ــــ خیر اس میں تو تلوہ سرے سے تھا ہی نہیں اور اس کی زندگی کا دار و مدار صرف ایڑی پر تھا! پھر بھی چمڑے کا بوٹ کچھ برا نہیں!

گداگر نے لوہے کی ٹیڑھی سلاخ لے کر انگاروں کو ہلایا، ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے کے ساتھ راکھ اڑی اور دونوں کے گرد ناچتی، چکر کاٹتی ہوئی اُن کے شانوں اور سر پہ بیٹھ گئی۔ ایک طویل سکوت کے بعد بوڑھے نے پُوچھا "کہاں جاؤ گے بابو؟ ایسی رات میں پڑا پھرنا کچھ بھلی بات نہیں؟"

اس نے کہا "جان بوجھ کر کون پھرتا ہے بابا؟ میرا کوئی گھر نہیں اور میں بھوکا ہوں!"
یہ فقرہ کہتے ہوئے اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کی خودداری کا آبگینہ ٹکڑے ٹکڑے

ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوٹل کی ایک میز چکّر لگانے لگی۔ اُس کے ایک دیرینہ دوست نے، جسے وہ اتفاق سے بازار میں مل گیا تھا۔ بہت اصرار سے ہوٹل کی طرف کھینچا تھا اور وہ بصد مشکل اُسے اپنے ساتھ لے بھی گیا تھا اور میز کے سامنے بیٹھے بیٹھے اُس نے دیر تک کھانے کے لئے کہا تھا۔ لیکن اُس وقت اس نے اپنی بھوک کی شدت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اب اس نے جانا جیسے کوئی چیز اُس کی روح کے اندر یکایک ٹوٹ گئی اور اس کے ٹوٹنے کی آواز اس کے کانوں کو سنائی دی۔ پل کی دیوار پر ناچتے ہوئے سائے اسے اور بھی تیزی سے ناچتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ پل کا نشیب یکایک اُسے پل کے اوپر نظر آنے لگا، آگ کے شعلے دیوانہ وار پھڑپھڑانے لگے۔ انگارے آنکھیں پھاڑ کر ٹکٹکی لگائے اُس کی طرف گھورنے لگے اور دیودار کی لکڑی کے چھوٹے ٹکڑے چیخ چیخ کر تُف تُف کرنے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ہوا میں معلق ہے اور پل بھر میں اپنی مجرمانہ بزدلی کی پاداش میں زمین پر ٹپک دیا جائے گا اور اس کا جسم پاش پاش ہو جائے گا۔

لیکن اس نے دیکھا کہ بوڑھے کا لمبا لٹھ، لوٹا اور تین پوٹ جوں کے توں پڑے تھے۔ زمین پر آگ کے ڈھیر کے قریب! ہر چیز ویسی کی ویسی! گداگر نے کہا "بھائی بھوکے ہو تو کوئی بات نہیں۔ میرے پاس مونگ پھلی ہے، روٹی کے ٹکڑے ہیں، کچے گوشت کی تین بوٹیاں ہیں۔ میں نے بنئے کی دوکان سے آنکھ بچا کر تھوڑا سا نمک بھی اڑا لیا تھا۔ ویسے تو میرے پاس دال بھی ہے، ایک مُلا کے گھر سے ملی تھی!"

یہ کہہ کر اس نے اپنا کشکول آگے بڑھا دیا، مونگ پھلی، کچے گوشت کی سُرخ بوٹیوں کے ساتھ چپک رہی تھی۔ روٹی کے ٹکڑے دال میں لت پت ہو رہے تھے، ایک کونے میں چٹکی بھر نمک چمک رہا تھا۔ ایک لمحہ انتظار کے بعد بوڑھے گداگر نے وہ کشکول اُس کے آگے رکھ دیا، پھر اس نے کہا: "تم گوشت کی بوٹیاں آگ پر بھون لو، میں جا کر صاحب کی کوٹھی کے جنگلے سے دیار کی لکڑی توڑ کے لاتا ہوں۔ دیار کی لکڑی جلتی خوب ہے۔"

اس نے اپنا لٹھ اٹھایا اور لکڑی کی ٹانگ ٹیکتا ہوا پل کے اوپر چڑھنے لگا۔ دوسرے لمحے

ہیں پل سے اُس کے پاؤں کی ٹاپ گذر گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ بغل میں لکڑیاں دبائے لوٹا تو کشکول جوں کا توں دھرا تھا۔ انگاروں پر راکھ ابھر آئی تھی۔ ہوا کے ایک آدھ جھونکے سے راکھ اڑنے لگتی اور کبھی کبھی انگارے بھی اُٹھتے، بوڑھے نے بغیر کچھ کہے کشکول اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور لکڑیاں توڑ کر انگاروں پر ڈالنے لگا۔ شعلے پھر بھڑکنے لگے اور وہی سائے از سرِ نو دیوار پر ناچنے لگے۔ گداگر نے دیکھا۔ اُس کے مہمان کے دونوں ہاتھ تو گھٹنوں کے گرد مضبوطی سے حلقہ کئے ہیں اور اس کی گردن ہاتھوں اور شانوں کے حلقے میں جھکی جا رہی ہے۔ "سو گئے بابو؟" اس نے پوچھا۔ مہمان نے گردن اُٹھائی۔ واقعی اس کی آنکھیں مندھی جا رہی تھیں۔

"نہیں تو بابا۔ لکڑیاں لے آئے تم؟" ہونٹوں کو نیم وا کرتے ہوئے اس نے جواب دیا

"تمہیں نیند آ رہی ہے بابو۔ سو جاؤ۔ جاگ کر کیا کرے کوئی۔ جاگ کر سردی اور بھوک اور بھیک کے سوا تمہیں کیا ملے گا۔ سو جاؤ، کسی طرح سو جاؤ۔ لیکن سو جاؤ۔ جاگنے سے کچھ نہ ہوگا۔" بوڑھے کی آواز میں ایک بے پناہ جوش تھا اور لہجے میں دبی ہوئی کڑواہٹ، اُس نے انگاروں پر اور لکڑیاں ڈال دیں اور پھر اپنی گودڑی اٹھا کر اپنے مہمان کے سامنے پھینک دی۔ اس نے پھر کہا "سو جاؤ بابو، سو جاؤ۔"

سچ مچ اُسے نیند آنے لگی۔ وہ گودڑی ڈال کر لیٹ گیا۔ آگ کے شعلے کپکپاتے رہے۔ نیند ناچتی رہی۔ بوڑھے کی آنکھیں نہایت سکون سے انگاروں پر جم گئیں۔

سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ۔

دیوار پر صرف ایک سایہ ناچ رہا ہے۔ گداگر کی لاٹھی سکڑ کر صرف ایک بالشت رہ گئی ہے۔

سو جاؤ۔ سو جاؤ بابو،

شعلے کم ہو رہے ہیں۔ پانچ، تین، دو کشکول آپ ہی آپ کھسک کر اُس کی نگاہوں کے قریب ہونے لگے۔ قریب، قریب تر اور بھی قریب۔

سو جاؤ۔ سو جاؤ۔

بوڑھے کی داڑھی پھیل کر اندھیری رات کی طرح چھا گئی۔ وہ داڑھی کی اوٹ میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر سایہ ناچ رہا ہے۔ شعلے کم ہو رہے ہیں۔ تین . . . . دو . . . . دو . . . تین . . . دو . . . صرف دو . . . .

سو جاؤ

شعلہ صرف ایک باقی ہے ٹمٹماتا ہوا۔ جھلملاتا، بجھتا ہوا۔ ہر طرف سیاہی چھا رہی ہے۔ موت کی سی سیاہی . . . لیکن برف سفید برف دور تک پھیلی ہوئی ہے عجیب بات ہے موت اور برف، سپیدی اور سیاہی، ایک ہی بات ہے۔

سو جا . . . . سو۔

سیاہی اور سپیدی، سپیدی اور سیاہی۔ برف اور موت، ابد تک موت چھائی رہے گی۔ برف کے گالے زمین کو اپنی اوٹ میں لے کر کچل دیں گے۔ شعلہ ٹمٹما کر بجھ جائے گا۔ انسان آج رات سو کر کبھی نہ اٹھیں گے۔

(بوڑھے نے سنا دور کہیں ایک تانگا بھاگا جا رہا تھا۔ گھوڑے کے سموں کی ٹاپ تیزی سے دور ہوتی جاتی تھی)

سو . . . سو . . . .

زندگی بھاگی جا رہی ہے۔ بھوک، افلاس اور سردی سے تنگ آ کر، پھر وہ کبھی واپس لوٹ کر نہ آئے گی۔ برف کے گالے یونہی ابد تک پڑتے رہیں گے شعلہ ٹمٹما کر بجھ . . . .

شعلہ بھڑک کر لپکا اور لپک کر بجھ گیا۔ ہر چیز گل ہو گئی۔ ہر طرف سیاہی، موت اور برف بوڑھے کی ڈاڑھی، رات کی سیاہی، راکھ کا ڈھیر، کشکول مونگ پھلی، نمک . . . .

(۶)

زرد مرجھائے ہوئے چہروں کا ایک ہجوم، مردنی چھائی ہوئی، افلاس کی لعنت برستی ہوئی فاقہ مستی سے جھلسے ہوئے پچکے ہوئے گال، زرد مٹیالے دانت، موٹے موٹے دانت

دھنسی ہوئی آنکھیں، بے نور بجھی ہوئی آنکھوں میں غیض و غضب کا خون! ——
ماتھے پر صدیوں کی غلامی کے شکن اور ان میں بھوک، بیچارگی اور جہالت کی طویل داستان
—— ان سیاہ چہروں کا ایک ملا جلا انبوہ، ان کے سروں سے بلند تر بے شمار
لاٹھیاں، برچھیاں، تلواریں اور ٹکوے لہراتے ہوئے، کہیں کہیں ایک آدھ بندوق، انتقام
اور تباہی مچانے کے لئے بے قرار —— سوکھے ہوئے کمزور ہاتھوں میں لوہے
کی سی سختی ہے۔ کہیں کہیں میلی دھوتیوں کے نیچے کمان کی طرح باہر کو جھکی ہوئی ٹانگیں
شدتِ غضب سے کانپ رہی ہیں۔ اُن کے ننگے پاؤں سردی کی وجہ سے پھٹ کر
خون آلودہ ہو رہے ہیں۔ وہ سب بلک کر چیخنے لگے "روٹی۔ روٹی۔ روٹی"

یکایک ہجوم میں حرکت ہوئی اور وہ پہاڑی نالے کے لڑھکتے ہوئے پانی کی طرح
بے تحاشا ایک سمت کو سڑک پر بھاگنے لگا۔ چمکتی ہوئی تلواروں، لہراتی ہوئی لاٹھیوں
ننگے سروں اور نیلی سیاہ گردنوں کا ناچتا ہوا انبوہ! . . . برف پر کہیں لاشیں
بچھ گئیں۔ سفید برف پر سفید لاشیں اور اُن کے گرد خون کے دھبے . . . نفیس
اُونی لباس خون اور کیچڑ میں لت پت اور ان پر چمکیلے بٹن دمکتے ہوئے۔ پاس ہی
آبنوس کی سی سیاہ ٹانگیں میلی دھوتی میں لپٹی پڑی ہیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں، پھٹا ہوا
سینہ کھلے ہوئے منہ پر بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کا تانتا —— چار چوک میں شور بڑھنے لگا۔ ہجوم واپس لوٹ رہا تھا۔ تلواروں کی سفید چمک سرخی مائل ہو چکی تھی۔ برچھیوں
کی نوک سے لال قطرے ٹپک رہے تھے۔ بندوقوں کی نالیاں زمین کی طرف جھک
گئی تھیں۔ مگر سڑک کے دونوں طرف دو رنگ بنگلوں اور کوٹھیوں سے شعلے بلند ہو رہے
تھے۔ دھوئیں کا بادل آہستہ آہستہ سیاہ تر ہو رہا تھا۔ پیچھے پیچھے چیخ و پکار اور رونے کا
غل لحظہ بہ لحظہ دور کھچا جا رہا تھا . . . . بنگلے کے دونوں طرف شور اُٹھ رہا تھا۔ "جلا دو،
جلا دو، ہر چیز پھونک دو" کھڑکیاں، شیشے دروازے توڑ دیئے گئے۔ ایک آدھ نے تیل
ڈال کر دروازوں کو آگ دکھائی، کچھ آدمی قالین، دریاں اور ریشمی پردے کھینچ کر لے آئے

کچھ میز اور کرسیاں صوفے اور کوچ باہر گھسیٹ لائے۔ چند آدمی کتابوں کاغذوں اور کپڑوں کے بنڈل لے آئے چند لمحوں ہی میں صحن میں ایک انبار لگ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں انبار سے دھواں اٹھنے لگا۔ ہجوم کے ارد گرد جمع ہو گیا۔ ساتھ کے کمرے میں کسی کے کراہنے اور سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن وہ آواز ہجوم کے غل میں ڈوب کر رہ گئی۔ اون اور ریشم کے جلنے سے عجیب سی بو اٹھ رہی تھی اور صوفوں کی لکڑی کبھی کبھی دھماکے سے چیخ اٹھتی تھی — بوڑھے گداگر نے ہجوم میں سے نکل کر جنگلے کا رخ کیا اور وہ لکڑیاں توڑ کر آگ کے انبار پر ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی لکڑیاں ڈالتے ہوئے اس نے جھک کر کسی کے کان میں کہا: "دیار کی لکڑی جلتی خوب ہے" جنگلے کا سبز وارنش پگھل پگھل کر آگ میں ٹپکتا رہا اور ایک عجیب سی دماغ سوز بدبو اٹھتی رہی۔ لیکن وہ بوڑھا برابر جنگلے کی لکڑیاں توڑ توڑ کر آگ پر ڈالتا رہا۔ اس اجنبی نے دیکھا قریب ہی آگ کے ڈھیر میں کسی شبستان کے دریچے کا ایک ریشمی پردہ بھسم ہو رہا ہے۔ اور اس کے رنگا رنگ نقش و نگار راکھ بنتے جا رہے ہیں۔

. . . . اس نے بیتابی سے چپاتی اپنے ہاتھوں میں تھام لی پھیکے چاند کی طرح زرد توے پر پڑی پڑی اسکی چپاتی گیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے پیلی ہو گئی تھی۔ اور اس پر خون کے دو قطرے چمک رہے تھے کسی اجنبی عورت کے آویزوں کے نگینے کی طرح . . . . ! ایک کرسی نے اس کا بازو تھام لیا اور زور سے آگ کے ڈھیر کی طرف دھکیلنے لگا۔ قریب تھا کہ وہ آگ میں گر جائے۔ ڈھیر پا لکڑی چیخ اٹھی۔

یکایک وہ چونک اٹھا۔ بوڑھا گداگر اونگھ رہا تھا اور اس کا اپنا بازو سرد فرش پر پڑے پڑے شل ہو چکا تھا۔ وہ سنبھل کر اٹھ بیٹھا۔ گرد و پیش ہر چیز ویسی کی ویسی، بوڑھے کا لٹھ، بجھی ہوئی آگ کی راکھ کا ڈھیر، ٹوٹے ہوئے بوٹوں کی جوڑی کشکول، لوٹے کی ٹونٹی اور بوڑھے کی پچکی ہوئی ناک . . . .

اوپر پل پر سے کوئی راہگیر گذرا۔ وہ دھیمے سُر میں گا رہا تھا: "کیسے کٹے گی رات!" اس کے کندھے پر لٹھ تھا، جس کا ایک سرا آسمان کی طرف اٹھا ہوا لہرا رہا تھا۔ شاید شمعل کے لئے تیار لیکن وقت کا منتظر . . . !!! ؁

اوپندر ناتھ اشک

ایک جھلک

کچھ دن بعد ہی آنند کو چیتن کا ایک اور خط ملا جس میں کسی لڑکی پرکاشو کا ذکر تھا۔

"تمہیں ایک دلچسپ بات سناتا ہوں" چیتن نے لکھا تھا: "ہمارے مکان کے سامنے ایک تانگے والا رہتا ہے جس مکان میں وہ رہتا ہے اگرچہ وہ دو منزلہ ہے لیکن پھر بھی اُسے مکان کہنے میں جھجک ہوتی ہے — ایک کوٹھڑی اور ایک چھوٹا داوپر سے کھلا، آنگن اوپر کی منزل میں ہے۔ اور دو اندھیری کوٹھڑیاں نچلی منزل میں — اوپر کی منزل میں تانگے والے کا کنبہ رہتا ہے، اور نچلی منزل میں رحیم چنگڑ، جس کی بیوی 'فاقاں' صبح سے لیکر شام تک ایسی ایسی گالیاں دیتی ہے کہ روح کانپ جاتی ہے۔ کمبخت نے ایسا غضب کا دماغ پایا ہے کہ ایک گالی سے دوسری گالی کبھی نہیں ملتی۔

تانگے والے کی ایک ماں ہے، بہن ہے اور دو چھوٹے بچے ہیں۔ اس کی یہ بہن میں دیکھ رہا ہوں کچھ دنوں سے مجھ میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا لکھا کرتا ہوں۔ تو وہ کھڑکی میں آجاتی ہے یہ کھڑکی ایک کھلا سا بڑا جھروکا ہے۔ کواڑ یا سلاخیں اس میں نام کو نہیں ——— دھوپ تیز ہونے پر بھی وہ اس جھروکے میں بیٹھی رہتی ہے۔

موٹی بدنما اور پھوہڑ ——— اُسے عشق کرنے کو بھی کوئی اور نہیں ملا لیکن آنند من ہی تو ہے . . . .

اور پھر جب دفتر سے چیف ایڈیٹر کی جھڑکیاں اور کوسنے سن کر آتا ہوں اور اپنے جھروکے میں بیٹھی اپنے موٹے ہونٹوں پہ میٹھی مسکراہٹ لا کر وہ میرا خیر مقدم کرتی ہے تو آنند جی ہرا سا ہو جاتا ہے۔ اور اُس نامعقول ایڈیٹر کی باتوں سے دل پہ ہونے والے زخم بھر سے جاتے ہیں۔"

اور پھر اسی پرکاشو کے متعلق چیتن نے کچھ ایسی باتیں لکھیں کہ آنند جب ایک بار اپنے بہنوئی کے پاس پنڈی گیا تو آتا آتا لاہور اُتر گیا۔ ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہ بنگالی گلی میں واقع چیتن کے دفتر پہنچا لیکن اتوار ہونے کی وجہ سے دفتر بند تھا تب پیپل وہڑا چینگڑ محلہ کا پتہ پوچھتا پوچھتا وہ چل پڑا۔

صبح کا وقت تھا اور خواہ میونسپل کمیٹی کے بھنگی اور بہشتی اپنا فرض پورا کر گئے تھے۔ لیکن گندگی کی گاڑیاں بھی اپنے فرائض بوجہ احسن سرانجام دے رہی تھیں۔ در حقیقت گھوڑوں کے اصطبلوں گندی گاڑیوں کے ہالٹنگ سٹیشنوں اور چماروں کے گھروں کے نزدیک ہونے کی وجہ سے بہشتی چاہے تھا کیسے کھٹے کی ماتا بھنگی چاہے لاکھ صفائی کر جائے چینگڑ محلے کی حالت میں کب اٹھا ہوا لہرا رہا تھا۔ شاید نزدیک ہی اتنا بے رونق، گندا اور مفلوک الحال علاقہ ہو

بھی یہ نہ سوچا تھا۔ اِدھر چنگڑ محلے میں کچھ نئی دوکانیں بن گئی ہیں۔ اور رونق بھی قدرے بڑھ گئی ہے لیکن اُس وقت تو سارے کے سارے بازار میں دو تین لانڈریوں، ایک میلے کچیلے بنئے اور دو ایک ہندو اور مسلمان حلوائیوں کی غلیظ دوکانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

موہن لال روڈ کی طرف سے داخل ہو کر، ناک پر رومال رکھے، کسی نہ کسی طرح آنند پیپل دہڑہ کو جانے والی گلی کے سرے پہ آ کھڑا ہوا ——— پختہ اینٹوں کی دو سیڑھیوں کے ساتھ بازار سے ذرا اونچی پکّی اینٹوں کی ہی یہ گلی بنی ہوئی تھی۔ سامنے ایک اونچا سہ منزلہ مکان تھا جس کی کھڑکیاں گہرے سرمئی رنگ کی تھیں۔ آنند نے اطمینان کا سانس لیا کہ آخر وہ اچھی صاف جگہ پہنچ گیا لیکن جب لالہ بھگوانداس کا مکان پوچھتا پوچھتا وہ چند قدم چل کر اُس سامنے والے نئے مکان کے پاس سے ہوتا ہوا دائیں طرف تنگ سی گلی کو مڑا تو اُس نے اچانک ناک پہ پھر رومال رکھ لیا ——— گوبر کی ایک تیکھی بُو اُس کی ناک میں گھس گئی اور اِس کے ساتھ ہی کسی کی کرخت آواز اُس کے کانوں میں پڑی ——— جس کے ایک فقرے میں قریباً سب کی سب گالیاں ہی تھیں۔

ایک دو پکّے مکانوں کے علاوہ، اس گلی میں سب مکان کچے ہی تھے، جن میں چنگڑ رہتے تھے۔ اِس تنگ سی گلی کا نام دراصل پیپل وہڑہ تھا۔ اور یہیں لالہ بھگوانداس نے اپنے 'ساہوکارے' کی بدولت اصل اور سود ملا کر، ان چنگڑوں میں سے ہی کچھ جھونپڑیاں مول لے کر یا قرق کروا کہ دو تین پکے مکان بنوا لیئے تھے۔

گلی کے سرے پر ہی اپنے کچّے مکان کی دہلیز میں ایک کالا بھجنگ چنگڑ بیٹھا مزے سے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ آنند نے اُسی سے لالہ بھگوانداس کے مکان کا پتہ پوچھا۔ اور جب اُس نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے ساتھ والے پکے تین منزلہ مکان کی طرف اشارہ کر دیا۔ تو آنند نے اُس مکان کے پاس جا کر چیتن کا نام لے کر آواز دی۔

کبھی زمانے میں یہاں شاید کھلی جگہ، یا چوک، یا آنگن ہوگا۔ ہو سکتا ہے پیپل کا کوئی درخت بھی ہو لیکن اُس وقت تو دونوں میں سے کوئی چیز وہاں نہ تھی۔ مکان کے ساتھ

دس بارہ فٹ کھلی جگہ تھی۔ جسے ایک کندھوں تک اونچے پکے پردے کے ذریعے گلی سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ جگہ پکی تھی۔ اور اُس کے عین وسط میں ایک نالی مکان کے تمام باشندوں کے ذریعے بہایا ہوا گندہ پانی لا کر گلی کی بدررو میں ملا دیتی تھی۔ اس نالی کی جو حالت تھی اُس سے آنند نے مکینوں کی تہذیب اور زندگی کے معیار کا کچھ کچھ اندازہ لگا لیا ——

رہا مکان —— تو تین منزلوں میں سے نچلی منزل کے وسط میں ایک ڈیوڑھی تھی جس کے پرے تنگ اور تاریک سا آنگن دکھائی دیتا تھا۔ اس ڈیوڑھی کے دونوں طرف سیڑھیاں چڑھتی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مکان دو حصوں میں منقسم ہے (حالانکہ یہ مکان تین حصوں میں منقسم تھا۔ اور ان تین حصوں میں ۹ کرایہ دار رہتے تھے لیکن اس بات کا آنند کو بعد میں پتہ چلا) اسی نچلی منزل میں ڈیوڑھی کے دونوں طرف دو دو دروازوں والے دو کمرے تھے۔ ان کے اوپر دوسری منزل میں دو اور کمرے تھے جن کی میلی کھڑکیاں، زبانِ حال سے اپنی زبوں حالی کی فریاد کر رہی تھیں۔ تیسری منزل پہ آنند کو اینٹوں کے پردے ہی دکھائی دیئے —— لالہ بھگوان داس کا مکان ان ہزاروں مکانوں میں سے ایک تھا جو لاہور کے مالک مکان غریب کرائے داروں کے لئے بناتے ہیں۔

آنند کی آواز سن کر دائیں طرف کے نچلے کمرے سے (جس کے دروازوں پر گہرے زرد رنگ کی چقیں لٹک رہی تھیں) چیتن نکلا۔ کمر تک جسم ننگا تھا اور اس کے بعد تہمد لٹک رہا تھا۔

آنند کو دیکھ کر اور مسرت کی ایک 'اوہ' کر کے ہاتھ ملاتا ہوا چیتن اُسے اندر لے گیا۔ نمدار تاریک کمرہ جس کی دیواروں کی سفیدی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس گرا ہی چاہتی ہے۔ چقوں والے ان دو دروازوں اور آنگن میں کھلنے والے ایک اور دروازے کے علاوہ (جو اس وقت بند تھا) ایک بھی روشندان اس کمرے میں نہ تھا۔ سیل بھرے نمدار کمروں سے جیسی بو سی آنے لگتی ہے ویسی ہی سیلی، گلا گھونٹنے والی سی بو اس

کمرے سے آ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی الماری نہ تھی۔ یونہی دو جگہ طاق بنا کر تختے لگا دیئے گئے تھے۔ چھت کی کڑیاں دھوئیں سے کالی سیاہ ہو رہی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلے کرایہ دار کی رسوئی بھی ضرور یہی ہو گی۔ نیچے سیمنٹ کا فرش تو تھا لیکن اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ کمرہ، لیکن، صاف تھا۔ اور چیتن کے ننگے بدن کی گرد بتا رہی تھی۔ کہ اس نے ابھی ابھی اُسے صاف کیا ہے۔ فرنیچر کے نام پر ایک طرف کونے میں ایک سیاہ میز پڑا تھا۔ اُس کے پاس بازوؤں کے بغیر ایک کالی گدے دار کرسی اور روشنی کے لیئے دیوار میں میخ گاڑ کر ایک بجلی کا بلب لگا یا گیا تھا۔

"یہ میز کہاں سے لائے ہو؟" آنند نے پوچھا "بنا تو خوب ہے" اور ہے بھی شاید آبنوس کی لکڑی کا . . . لیکن معلوم تو سیکنڈ ہینڈ ہوتا ہے!"

"بلکہ تھرڈ ہینڈ" چیتن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میں تو ایک کباڑیئے کی دکان سے ۱۱ روپے میں اُٹھا لایا" پھر قدرے فلسفیانہ انداز میں اُس نے کہا "ہم سب ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ آنند! ہمارا اُتار غریب بڑے شوق سے قبول کرتے ہیں اور امیروں کا اُتار ہم —— اور وہ ایک کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔

آنند نے اور نزدیک ہو کر دیکھا تو گاڑھے روغن اور پوٹین کی امداد سے کئی جوڑ ڈھکے ہوئے دکھائی دیئے۔ نہ جانے کتنی بار مرمّت ہو کر یہ میز اور کرسی، اس ہونہار مصنّف کے یہاں پہنچے تھے۔

"اندر ہی آ جاؤ!"

آنند نے دھیان ہی نہ دیا تھا کہ اندر بھی کوئی کمرہ ہے۔ اُن گھڑ سے کواڑوں کو کھول کر چیتن اندر گیا، بجلی کا بٹن اُس نے دبایا۔ آنند نے دیکھا کہ ایک اندھیری کوٹھری ہے جس کی سامنے کی طرف دائیں دیوار میں پہلے کمرے جیسے ہی طاق ہیں بائیں دیوار میں دبا ہی ان گھڑ کواڑوں کا دروازہ ہے۔ جو شاید کسی دوسرے کمرے میں کھلتا ہے ایک سستی سی چارپائی بچھی ہے۔ جس پر نہایت صاف بستر لگا ہے۔ نمی کی بُو یہاں پہلے

لے استعمال شدہ کپڑے وغیرہ

کمرے سے بھی زیادہ ہے۔ روشندان کیا ایک سوراخ تک بھی کہیں نہیں اور دیواروں کی سفیدی بہت جگہ سے گر چکی ہے ——— ہاں ٹھنڈک اِس کوٹھڑی میں باہر سے زیادہ ہے ——— آنند چپ چاپ چارپائی پر لیٹ گیا۔

لیکن زیادہ دیر تک وہ وہاں لیٹا نہ رہ سکا۔ دوپہر کو اس کمرہ میں ضرور ٹھنڈک زیادہ ہوتی ہوگی لیکن صبح صبح اِس میں حبس زیادہ تھا۔ وہ اُٹھ کر باہر آیا تب دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایزی چیئر چیتن نے بچھا دی تھی سامنے کے مکان کی کھڑکی میں ایک لڑکی آ کھڑی ہوئی۔

چیتن نے آہستہ سے کہا: "پرکاشو!"

لیکن کسی اجنبی کو چیتن کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ فوراً چلی گئی۔

غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر جب گنپت روڈ کے تندور نما ہوٹل سے چیتن اپنے اس بچپن کے دوست کو کھانا کھلا لایا تو دونوں اندر کی چارپائی کو باہر نکال کر اس پر لیٹ گئے اور پھر وہیں لیٹے لیٹے چیتن نے اسے اپنے مکان کا کچھ تعارف کرایا۔

پانچ چھ مرلے میں بنے ہوئے اس تین منزلہ مکان میں دس کرایہ دار رہتے تھے آنگن میں ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اور چونکہ کمیٹی کا نل مکان میں نہ آیا تھا اور کوئی کامن باتھ روم وہاں تھا نہیں، اس لئے وہ ہینڈ پمپ غسل خانہ کا بھی کام دیتا تھا۔ اگرچہ چیتن وہاں سے بالٹی بھر کر اپنے اِس ڈرائنگ روم میں ہی نہاتا تھا۔

اسی ہینڈ پمپ کے سامنے دو کوٹھڑیوں میں رنگ ساز لڑکے رہتے تھے۔ جو دن بھر فیکٹری میں کام کرتے تھے اور رات کو سونے کے لئے وہاں آجاتے تھے چیتن کے کمرے کے سامنے دوسرے حصے میں ایک حلوائی رہتا تھا جس کی بیوی نے اپنے اُس کمرے کو چھوٹا موٹا مندر بنا رکھا تھا ——— غریب جنگڑوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی سود در سود میں اُن کے یہاں آ رہی تھی۔ اور اُن کے بوسیدہ کپڑوں کے تاراُن کے ریشمی

ملبوسات میں بدل رہے تھے۔ پھر چنگڑوں کی ایک دو جھونپڑیوں کی جگہ ان کا مکان بن گیا تھا۔ اور اس میں کچھ مشتبہ قسم کے لوگ رہتے تھے ———— ایک عورت تھی چلتی پھرتی سی، اُس کے پاس کچھ نوجوان لڑکیاں تھیں، اور رات کے تاریک سایوں میں چھپ کر کچھ لوگ نت وہاں آیا کرتے تھے (اگرچہ چیتن نے اُن کے متعلق کبھی کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی) اس کے علاوہ، اُس بڑھتی ہوئی جائداد کو سنبھالنے والا کوئی نہ پیدا ہوا تھا۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے صبح و شام وہاں بھگوان کی پوجا میں گھنٹے گھڑیال بجا کرتے تھے۔

دوسری منزل میں چیتن کے عین اوپر، بھارت انشورنش کمپنی میں کام کرنے والا ایک کلرک اور اس کا ساتھی رہتے تھے۔ اور ان میں سے ایک کی ماں بھی ساتھ تھی۔ رسوئی خانہ چونکہ تھا نہیں، اس لیے اوپر کی منزل ہی میں وہ رسوئی بناتے تھے۔ اور جس دن کبھی مطلع ابر آلود ہوتا اور ہوا چلتی تو ان کے رسوئی نما ڈرائنگ روم کا دھواں چیتن کے اس باتھ نما ڈرائنگ روم میں آجاتا تھا۔

ڈیوڑھی کے اوپر آدھے چھتے آنگن اور پچھلی دو کوٹھڑیوں میں ایک کمپازیٹر

د) اس کی بیوہ بھاوج اور اُس کے بچے دس بارہ برس کی ایک لڑکی، اور سات آٹھ سال کا کانا لڑکا، کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن گذار رہے تھے۔

حلوائی کے اوپر دو کمروں میں پرائمری سکول کا ایک ماسٹر تھا۔

تیسری منزل پر تینوں حصوں میں ایک ایک برساتی بنی ہوئی تھی۔ جن میں بالترتیب ایک خوانچے والا، ایک ڈاکیہ، ایک پنواڑی مع اہل و عیال کے رہتے تھے اور چلتی دھوپ ہو یا چھبتی سردی، کھانا برساتی کے آگے چھت پر پردہ سا کر کے بنایا کرتے تھے۔

ان سب نو دس کرایہ داروں کے لئے صرف تین کامن بیت الخلا تھے۔ بیٹھنے اُٹھنے، کھانے، سونے، نہانے کا کام سب اپنے اپنے کمرے سے لیتے تھے۔

گرمیوں میں سونے کا انتظام یوں ہوتا ——— نچلی منزل والے پردے اور مکان سے درمیان کھلی جگہ میں نالی کے اوپر سوتے۔ درمیان کی منزل میں رہنے والے برآمدوں کے مکین اپنی برسانیوں کے آگے۔

اس مکان اور اُس کے مکینوں کا تعارف کرانے کے بعد چیتن نے کہا ———

"تمہیں یہ سُنکر حیرانی ہوگی کہ یہ دو کمرے بھی مجھے بڑی مشکل سے ملے۔ لاہور کے گلی محلوں میں کسی مجرّد کے لئے کوئی کمرہ کرائے پر لے لینا آسان بات نہیں۔ ساتھ کوئی عورت ہونی چاہیئے، خواہ ماں، بہن، چچی، تائی، خالہ پھوپھی، بیوی، بھاوج، یہاں تک کہ کہیں سے بھگائی کیوں نہ ہو۔"

یہاں چیتن نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر بولا: "لیکن میں نے بھی ان لوگوں کو خوب بنایا۔ تمہیں یاد ہوں گے نہ ہنر صاحب، وہی، جو دُنیا بھر کے شعراء کی چیزیں اپنے نام سے سنا کر جالندھر میں مجھ پر رعب غالب کرتے تھے۔ اور جنہیں من ہی من میں میں نے گورو بھی دھار لیا تھا۔ اور اِس عقیدت کے صدقے پانچ روپے بھی جن کی نذر کر دئے تھے۔ انہی کے یہاں پنجاب ہند و ہوٹل چھوڑنے کے بعد میں رہا۔ دوسرا کوئی واقف نہ تھا۔ لیکن جب مہینے کے بعد ہنر صاحب نے یہ بتا کر سولہ روپے انہیں مکان کا کرایہ دینا پڑتا ہے، آٹھ روپے مجھ سے مانگ لئے اور یہ پیشکش بھی کی کہ کھانا بھی میں اُنہیں کے ہاں سے کھایا کروں اور سب کے لئے صرف، بیس روپے وہ مجھ سے لے لیا کریں گے اور ناصحانہ انداز میں کہا کہ اپنا آدمی ساتھ ہو تو ہماری اُماری میں سو امداد ہو جاتی ہے — تو اسی دن شام کو میں مکان کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہ بھی خیال تھا کہ دفتر کے پاس ہی کہیں مل جائے تو رات کو خواب آلودہ آنکھیں لئے میل، ڈیڑھ میل چلکر مزنگ پہنچنے کی مصیبت سے بھی نجات ملے ——— لیکن پانچ چھ جگہ پوچھنے پر ہی پتہ چل گیا کہ مہذب علاقے میں کسی کنوارے کیلئے کمرہ لے لینا کچھ ناممکن سا ہے۔"

"اِس جھگڑ محلے میں بھی،" چیتن نے ہنسکر کہا: "ادھ چھتے آنگن پر رہنے والی بیوہ

نے پوچھا کہ میں اکیلا ہی ہوں یا ایک عدد بیوی بھی پال رکھی ہے۔ تب میں نے کہہ دیا کہ بیوی میری ہے لیکن چونکہ اُسے ابھی امتحان دینا ہے۔ اس لئے میرے ساتھ نہ آسکے گی۔"

آنند نے ہنس کر کہا: "لیکن اب تو امتحانات ہو چکے۔"

چیتن بولا: "پچھلی چھٹیوں میں نے کہہ دیا کہ میری بیوی صوبہ بھر میں اوّل رہی ہے اس لئے اسے امتحان دیتے ہی سکول میں ملازمت مل گئی ہے۔ اب میں کوشش کروں گا کہ اس کی بھی تبدیلی لاہور ہی میں ہو جائے۔"

اس پر دونوں دوستوں نے قہقہہ لگایا، اُس وقت آنند نے دیکھا کہ وہ لڑکی وہ پرکاشو چپ چاپ جھروکے میں آ کھڑی ہوئی ہے (در حقیقت ایک دروازے کی چوکھٹ قدرے نیچی لگی تھی؛ اچانک لگ گئی تھی یا چیتن نے دیدہ دانستہ اسے اس طرح لگایا تھا کہ اس کے اوپر سے جھروکے میں بیٹھا ہوا آدمی بخوبی دکھائی دے سکے۔ یہ معلوم نہیں، لیکن وہیں سے آنند نے اس لڑکی کو دیکھا)

وہیں لیٹے لیٹے آنند نے کندھے سے ہلا کر چیتن کی توجہ اس طرف مبذول کی۔

آہستہ سے چیتن نے کہا: "تم یہیں لیٹے رہو، شاید وہ تمہیں نہیں دیکھ رہی۔"

اس کے بعد دو گھنٹے تک جو کچھ ہوا اس کے نتیجے کے طور پر آنند نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لڑکی کو چیتن سے عشق کی حد تک محبت ہے۔ اور جب چیتن نے اسے بتایا کہ دوسرے نلکوں کو چھوڑ کر اب پرکاشو کچھ دنوں سے ان کے ہینڈ پمپ پر ہی پانی بھرنے آنے لگی ہے (کیونکہ گھر والوں کو اس نے یقین دلایا ہے کہ کمیٹی کے نلکوں کی بہ نسبت ہینڈ پمپ کا پانی زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے) تو آنند نے مشورہ دیا کہ آج جب وہ ہینڈ پمپ پر پانی لینے آئے، اسے پکڑ کر بس فوراً لے آنا چاہیئے۔ "وہ تو تمہاری آغوش میں آنے کے لئے چھٹپٹا رہی ہے۔" اس نے کہا: "تم جرأت سے کام نہ لوگے تو یہ معاملہ آگے نہ بڑھے گا۔"

لیکن چھیتن کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ تب آنند نے ڈیڑھ گھنٹے تک محبت کے معاملے میں اپنے حوصلہ اور دلیری کی جو جو داستانیں سنائیں، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چھیتن اس جرأتِ رندانہ کے لئے تیار ہو گیا۔

عام طور پر پرکاشو شام سے بہت پہلے ہی آتی تھی، جب عموماً ساتھ کی حلوائن اور اوپر آنگن میں رہنے والی بیوہ اپنے بچّوں کے ساتھ سو رہی ہوتی۔ اور آنگن میں سنّاٹا ہوتا ——— اس کے آنے سے پہلے آنند نے چھیتن کو اس طرح تیار کیا کہ وہ آنگن میں کھلنے والے اپنے دروازے میں کھڑا رہے گا۔ خود آنند دروازے کی اوٹ میں بیٹھا رہے گا۔ اور کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو سنبھال لے گا۔

جب پرکاشو وقت پر پانی لینے آئی اور بالٹی پمپ کے نیچے رکھ چکی اور چھیتن کی طرف ایک دو بار کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرا بھی چکی۔ تو آنند نے کہنی کے ٹھوکے سے چھیتن کو جانے کے لئے کہا لیکن اگرچہ اُس نے تین بار چھیتن کی کمر میں کہنی گاڑ دی لیکن چھیتن ٹس سے مس نہ ہوا اور پانی بھرنے کے بعد پرکاشو بالٹی اٹھا کر اپنے موٹے ہونٹوں سے مسکراتی اور اپنے بھاری کولہے مٹکاتی ہوئی چلی گئی۔

تب آنند نے خالص دوآبے کی زبان میں چھیتن کو بیٹھے بٹھائے سنائے اور فتوے دیا کہ وہ بالکل نامرد ہے۔

شاید یہ لفظ سننا چھیتن کی مردانگی کو گوارا نہ تھا۔ اس لئے جب پرکاشو دوسری بار آئی اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اور اپنے موٹے ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے اُس نے ایک دو بار ہینڈل گھمایا تو چھیتن نے ایک بار ہی جست بھری۔

"ہائے میں مر گئی" کہتی ہوئی پرکاشو ہینڈل چھوڑ، وہیں بیٹھ گئی چھیتن کے چہرے پر جیسے سیاہی پت گئی اور اُس کے باز دھلکے کے کھلے رہ گئے۔

فوراً وہ پیچھے کو پھرا اور خالی بالٹی لے کر پرکاشو چلی گئی۔

تب کمرے میں آکر بیس تو گالیاں چھیتن نے آنند کو دیں اور کہا کہ اگر کسی نے دیکھ

سن لیا یا پرکاشو نے جاکر گھر کہدیا تو کیا ہوگا؟ سنبھال سنبھال کر رکھی ہوئی آبرو پہ پانی پھر جائے گا۔ بے آبرو ہو کر محلے سے الگ نکلنا پڑے گا۔ دفتر کے پاس جگہ نہ ملے گی۔ اور پھر مکان ڈھونڈنے کی مصیبت الگ گلے پڑ جائے گی اور بیوی اُس کی اب بھی کوئی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آنند نے دیکھا کہ چیتن کا چہرہ کپاس کے پھول کی طرح زرد ہو رہا ہے۔ رنگ اُس کا فق ہے اور پاؤں کانپ رہے ہیں۔ تب ایک کیلے کا چھلکا کہیں سے لاکر اُس نے آنگن کے درمیان رکھ دیا اُسے پاؤں سے مسل دیا اور چیتن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کہ اوّل تو پرکاشو گھر جاکر کہے گی نہیں۔ اور اگر اُس نے یہ حماقت کی بھی اور تم سے کسی نے پوچھا تو تم یہ کہہ دینا، میں باہر جانے لگا تھا۔ کیلے کے چھلکے پر پاؤں پھسل گیا۔ بازو میں نے ضرور پھیلائے تھے۔ اور پکڑنا بھی میں نے چاہا تھا۔ لیکن وہ تو گرتے ہوئے کی مجبوری تھی۔"

چیتن کو لیکن اس سے کچھ زیادہ تسلی نہیں ملی۔ یہ اور بات ہے کہ پرکاشو نے گھر جاکر کچھ نہیں کہا ؂

(ناول چیتن سے)

نیم چندر

ہندی میں ترقی پسند ادب

کسی سماج معاشرت اور اسکے ادب کا اندازہ اُس کی معاشی حالت کو دیکھ کر سکتے ہیں یو سائٹی میں جس طبقے کے ہاتھ میں باگ حکومت، اور تخلیق کے ذرائع وغیرہ ہونگے اُسی طرح، اُس طبقے کی ذہنیت کے مطابق اُس کا ادب ہوگا۔ ہندوستان کی سماجی حالت بہت عرصہ تک، غالباً انگریزوں کے یہاں آکر بس جانے تک سامنت شاہی تھی مختلف فاتح یہاں آئے، کچھ بس گئے، کچھ چلے گئے، لیکن ہندوستان کی سماجی حالت تھوڑے بہت سطحی تغیر کے ساتھ دراصل ویسی ہی بنی رہی۔ اِسی لئے ان دنوں کا ہندوستانی ادب اصل میں ایک سا ہی ہے۔ ہندی میں بہادروں کے گن گانے والے دَور کی تعریفی شاعری، بھگتی کی شاعری اور پھر جنسی شاعری، سب میں اسی سامنت شاہی سماجک آدرشوں کی روایات دَور کے مطابق تھوڑے سے تغیر کے ساتھ موجود ہیں۔

اصلی تبدیلی اُس وقت شروع ہوئی جب انگریز یہاں آکر بس گئے اور ان کے ساتھ مغربی تہذیب اور اُنکے ترقی یافتہ خیالات یہاں پھیلنے لگے اور اُس کا ہندستانی زندگی اور معاشرت پر گہرا اثر پڑنا شروع ہوا۔ ادب میں اُس کی پُرانی روایات میں بھی ایک زبردست تبدیلی ہونی شروع ہوئی جس میں پُرانا سب کچھ ترک کر دیا گیا۔ قید وبند کی جگہ آزادی کی آواز اُٹھی اور اس طرح ہندوستانی کے پُرانے طرزِ تفکّر سے بالکل مختلف نئے عقائد کی ادب میں شمولیت ہوئی۔ بھارتیندو کے وقت سے ادب میں پُرانے سائنتی ادبی عقائد کے ٹوٹنے اور نئے آدرشوں کی چھاپ ملنے لگتی ہے۔ نئی معاشرت کے تحت میں آجانے کی وجہ سے ادب میں بھی حوصلہ و امید کے نشانات نظر آتے ہیں۔ میتھلی شرن گپت کی کتاب "بھارت بھارتی" میں یہ حوصلہ افزا تاثر بہت اُبھر آیا ہے۔ لیکن جلد ہی یہ اُمید اور یہ حوصلے کے جذبات فنا ہونے لگتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ سماج کے پیچھے چھپے ہوئے ہیبت ناک دیو کا احساس آہستہ آہستہ ہونے لگتا ہے۔ انسان اور سوسائٹی کی طاقتوں کا بھیانک منظر سامنے آنے لگتا ہے اُس وقت ادب میں ایک طرف تو بغاوت اور ذاتی آزادی کی رَو چلتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ 'ناش واد' اور 'پرتی واد' کی دھارا بنتی ہے، اور دوسری طرف تخیلی اور رومانوی شاعری کا جنم ہوتا ہے لیکن ادب کی ان دونوں رَوؤں کا اختتام یاس اور درد پستی میں ہوتا ہے۔ درد یاس کا ایسا ہر جگہ پھیلا ہوا جذبہ ذاتی اور اجتماعی اختلاط ——— د ( ) کی انتہا ہے اور یہ سوسائٹی کے آہستہ آہستہ کھوکھلے ہو جانے کی خبر دیتی ہے۔ جے شنکر پرساد، مہادیو ورما، پنت، یوگا قت اور سمترا نندن پنت اسی دور کے ادیب ہیں۔

لیکن سرمایہ داری اپنی فنا کا سامان خود اکٹھا کر لیتی ہے اور اسی سے جہاں ایک طرف سرمایہ دارانہ معاشرت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسری طرف ایک نیا ترقی پسند فرقہ ایک نئی معاشرت کا پیام لیکر اُٹھنے لگتا ہے۔ یہ ترقی پسند طاقتیں آہستہ آہستہ قوی ہو کر سڑی ہوئی پُرانی معاشرت کو اکھاڑ پھینکنے کو متحد ہو جاتی ہیں

آج کے ادب میں بھیانک یاس اور شخصی رومانس کے بعد ترقی پسند طاقتوں کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے۔ پریم چند ہندی کے سب سے پہلے ترقی پسند ادیب تھے۔ ہندوستان کے مزدوروں اور دیہاتی زندگی کا اُن کا اتنا گہرا مطالعہ تھا کہ ترقی پسندی کے اصولوں کو نہ جانتے ہوئے بھی اُن کی تحریر میں ایک نئی آواز آ گئی ہے۔ ترقی پسندی کے بنیادی اصولوں سے اُن کو پوری واقفیت نہیں تھی۔ اس لئے اپنے خیالات میں وہ ہمیشہ اصلاح کا ہی پنے رہے سوسائٹی کے جسم میں سڑے ہوئے کوڑھ کو دیکھ کر اُن کا دل متاثر ضرور ہوا کئی بار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اس سے کراہت بھی ہوتی۔ لیکن اُس کے بنیادی سبب تک اُن کی نظر نہیں پہنچی 'سیوا سدن' اور پریم آشرم کے ذریعے ہی سرمایہ دارانہ تہذیب کے تضاد کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے! انقلاب اور فرقہ وارانہ جنگ کی بات انہوں نے نہیں سمجھی لیکن پھر بھی اُن کی تحریر میں زندگی کی اتنی تفصیل ہے' اور وہ اتنی زندہ ہے کہ اُس میں حقیقی ترقی پسند ہونے کے تمام نشان ہیں اور اپنے آخری دنوں میں تو وہ بہت تیزی سے ٹھیک راستے کی طرف آ رہے تھے اُن کی کفن کہانی میں بے حد تلخی آ گئی ہے۔ جو انہیں ایک حقیقی ترقی پسند کے قریب لے آتی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کی پہلی مجلس کے یہ صدر بھی ہوئے۔

لیکن آج کے ترقی پسند ادیبوں میں سمترا نندن پنت اول ہیں۔ پنت کو بہت دنوں تک ہندی دُنیا جذبات اور خوبصورتی کے شاعر کی حیثیت سے جانتی رہی لیکن جب اُس کے بیدار دماغ نے عقل کے ذریعے سوشل نشو ونما کی تاریخ کو سمجھا اور مشرقی سوسائٹی میں لگے ہوئے گھُن اور اُس کے خلاف اُٹھتی ہوئی ترقی پسند طاقت کو پہچانا تو اُن کے خیالات میں ایک قدرتی ردِ عمل ہوا اور جذباتی ہونے کی جگہ پر واقفیت اور حقیقت آ گئی "یگ وانی" میں ان کی نظمیں اس نظر سے یکطرفی ہیں لیکن پھر بھی انکے پیچھے تفکر ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ فلاسفی اُس میں اتنی گھُس گئی ہے کہ اُس میں آرٹ کی دھڑکن مدھم ہو کر ڈوب سی جاتی ہے لیکن وہ صرف ایک ردِ عمل تھا پنت کی دوسری

کتاب "گرامیہ" سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ آرٹ کی زندگی کی گونج اب صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ فلسفیانہ یک رُخی اب ان کی نظموں میں نہیں رہی۔ ان میں ایک نیا ترقی پسند پیام ہے۔ "یگ دانی" اور "گرامیہ" کا شاعر بے معنی انقلاب اور مبہم ذاتی بغاوت کا شاعر نہیں ہے۔ وہ اپنے انقلاب کا نصب العین اور منزل سب کچھ جانتا ہے۔ اور اُس کے بارے میں محض تخیلی نہیں ہے، وہ خواب نہیں دیکھتا بلکہ وہ حقیقت کو پہچانتا ہے سرمایہ داراتہ تہذیب کی برائیوں اور اُس کھوکھلے پن کو وہ جانتا ہے اور اُس کے اندر ہی اندر ترقی پسند طاقتوں کی جنگ کو بھی وہ سمجھتا ہے۔ اور اِسی دَور کے اِسی جنگ کو وہ آواز عطا کرتا ہے۔

نیپت کے علاوہ اور شاعر بھی ہیں۔ جن میں زمانے کی اِس جنگ کا اور سرمایہ داری کے طنز کا عکس ہے بھگوتی چرن ورما کی نظموں کا نیا مجموعہ امانو موجودہ تہذیب کے کھنڈر ہو جانے کا احساس کراتا ہے اور اُس میں موجودہ تہذیب سے باغی ہو جانے کی آواز ہے۔ دِنکر میں بھی اسی طرح زمانے کے خلاف، اِس دَور کے خلاف نفرت اور بغاوت ہے۔ اُن کی نظم دل پر ایک چیخ کا سا اثر کرتی ہے لیکن اِن دونوں شاعروں کے دماغی عقائد مستحکم نہیں ہیں اور اِسی لئے ان کی بغاوت کی کوئی منزل نہیں ہے یہ لوگ فنا کی آرزو کرتے ہیں جس میں اچھا بُرا سب تباہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے جذبات میں وطنیت ہے اور زندگی کے مسئلوں تک اُن کی رسائی کچھ جذباتی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ بال کرشن شرما نوین کو بھی انہیں قومی شاعروں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔

ان کے علاوہ اور شاعر بھی ہیں جن میں ترقی پسند ہونے کی جھلک نظر آتی ہے اور اُن میں رینبد شرما کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اُس کی نظموں میں کسی زبردست طاقت کے نشانات نظر آتے ہیں لیکن دراصل اب بھی ان میں دل اور دماغ کی ذہنی کش مکش ہوتی ہے۔ جن میں اکثر دل کی فتح ہوتی ہے افسانہ نویسی کے میدان میں ترقی پسندی کا زیادہ مظاہرہ ہوا ہے۔ اگییئے میں

روکاوٹوں کے خلاف بغاوت پھٹی پڑتی ہے۔ اُن کی کہانیوں میں ایک زوردار طاقت ایک آتش فشاں تیزی کے ساتھ سوسائٹی کے ساتھ ٹکراتی ہے۔ لیکن وہ ذاتی زیادہ ہے۔ اجتماعی کم اور یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ اس بغاوت کو صرف رفتار کا خیال ہے سمت کا نہیں۔ رادھا کرشن پرساد کی کتاب "دھبید" کی کہانیوں میں ایک زیادہ تیکھا جوش ظاہر ہوا ہے، اُن کہانیوں کے مصنف کی شخصی بغاوت فرقہ دارانہ جنگ پر منطبق ہو گئی ہے۔ اسی لئے اُن کے آرٹ میں (VITALITY) کم ہونے پر بھی چوٹ زیادہ اور گہری ہے۔ رام ورکش بینی پوری کی 'لال تارا'، اور یشپال کی کتابوں میں بھی جماعتی جنگ کی آواز ملتی ہے۔

ترقی کی تحریک کا سب سے زیادہ اثر تنقید کے پہلو پر ہوا ہے۔ جو قدرتی ہے۔ ترقی پسند ہونے کا پہلا تقاضا مفکر ہونا ہے۔ اجتماعی طور پر سوسائٹی میں جو تغیر ہو رہا ہے اُس کا خیالات پر اثر ہونا ضروری ہے۔ زمانے کی مانگ نے یہ لازمی کر دیا ہے کہ انسان سوچے۔ اسی لئے ترقی کے موضوع پر پچھلے دنوں بہت خیال آرائیاں ہوئیں۔ سبھی جریدوں میں اِس موضوع پر بحث کی گئی۔ ترقی کی تحریک کوئی باہر سے لائی ہوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اِسی بات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک ہوشمند ادیب کو اس پر غور کرنا پڑا ہے تنقید کے ترقی پسند معنوں کو سمجھا جا رہا ہے۔ اور ادب اور ادیبوں کا ترقی پسند نظر سے تجزیہ شروع ہو گیا ہے۔ اِس رُخ پر شو دان سنگھ چوہان نے کچھ بہت ہی غور طلب مضامین لکھے ہیں۔ شو دان سنگھ کی تنقیدی نظر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنی کسوٹی کے متعلق اُنکے دِل میں کہیں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ اِسی وجہ سے اُن کی طرز میں زور ہے۔ اور اُنکی تنقید بے لاگ اور صاف! سوسائٹی اور معاشرت کی تاریخ کا اُنہوں نے بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اسی سے اُن کے چند اپنے ترقی پسند عقائد بن گئے ہیں۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں 'وشال بھارت' میں چھپا ہوا اُن کا مضمون "ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی ضرورت" ہندی تنقید کے لئے روشنی کا مینار سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے کتنے ہی ترقی پسند نقادوں

ہیں پرکاش چندر گپت کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انہوں نے نئے نقطۂ نظر سے معاشرت، ترقی وغیرہ کے مسئلوں کو سمجھا ہے، اُن پر غور کیا ہے اور اپنے نظریوں کے ذریعے ادیبوں کے سامنے نئے نئے زاویے پیش کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ترقی پسند نقادوں میں نوجوان شاعر نریندر شرما کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ وہ "ہندی شاعری کے بیس برس" نامی ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کے کچھ حصّے اِدھر اُدھر پڑھنے کو ملے ہیں اس سے مصنف کی تیز نظر اور سنجیدہ فکر کا پتہ چلتا ہے۔

ترقی پسند نظریات اسی طرح آہستہ آہستہ وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ طاقتوں کو ادب کی کسوٹی بنانا ترقی کا پہلا کام ہے۔ اِس انقلاب کے دور میں بہت اونچا ادب شاید پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن سوشل اور معاشری ترقی کی تاریخ کو نظر میں رکھ کر ادب میں نئے راستے بنائے جا سکتے ہیں۔ ترقی کی تحریک کا ہندی ادب کو مستقبل میں یہی سب سے بڑا دان ہوگا کہ وہ نئے نظریے پیدا کرنے کے لئے زندگی کی سابقہ بنیادی طاقتوں کو سب کے سامنے کھول کر سامنے لا رہی ہے۔

گوپال مِتّل

دوراہا

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

اِدھر عیش کی بزم آراستہ ہے — اُدھر فرض کا پُر خطر راستہ ہے
اُدھر فاقہ مستوں کی آہ و بکا ہے — ربابِ مسرّت اِدھر نغمہ زا ہے
اُدھر سرفروشی، اِدھر دلنوازی — اِدھر کچھ حسیں اُس طرف چند غازی
اِدھر کامرانی کی دل کش اُمیدیں — اُدھر دلشکن، رُوح فرسا شکستیں
اِدھر کیف و مستی اُدھر تلخیٔ غم — اِدھر قہقہے اُس طرف چشمِ پُرنم
میں اے دل قدم کس طرف کو بڑھاؤں — میں یہ راہ پکڑوں کہ اُس سمت جاؤں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

اِدھر ہے غلامی کا بے رُوح نغمہ — اُدھر جانفزا حریت کا ترانہ
اِدھر بے حسی سے ہر اک جبر سہنا — اُدھر دل میں جو کچھ ہو بیباک کہنا
اِدھر پائے دولت پہ سر کو جھکانا — اُدھر شہریاری سے پنجہ لڑانا

اِدھر خوار ہونا خود اپنی نظر میں — اُدھر نشۂ سرکشی کی ترنگیں
اُدھر مال و دولت اِدھر جنسِ ایماں — ہے اِن میں سے کیا تیری راحت کا ساماں
میں اے دل کسے اپنا مقصد بناؤں — میں یہ راہ پکڑوں کہ اُس سمت جاؤں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

غریبی کا اپنے کو خوگر بنا لوں — کہ فطرت کا اپنی گلا گھونٹ ڈالوں
سنبھالے رکھوں حق پرستی کا پرچم — کہ میں بھی کروں مال و دولت فراہم
اسے پاؤں پہ لکشمی کے جھکا دوں — کہ سر اپنا راہِ وطن میں کٹا دوں
بغاوت کی تانیں اڑاتا چلوں میں — کہ خوابِ آفریں گیت گانے لگوں میں
وہ بزمِ طرب سے ہوا پھر اشارہ — سرِ دار اُدھر وہ کسی نے پکارا
میں اے دل کسے بڑھ کے لبیک کہہ دوں — میں اِس سمت جاؤں کہ وہ راہ پکڑوں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

مسافر!

اُٹھا رختِ سفر اپنا کہ وقتِ نازک آپہنچا — مسافر! اب نہیں ہے میزبانی کا یہیں یارا
یہی لازم ہے تجھ کو کوچ کی کر جلد تیاری — کہ اب برداشت کی حد سے فزوں ہے اپنی ناداری
نہ ایسا ہو کہ تجھ کو بھاگنا دشوار ہو جائے — ہماری مفلسی تیرے لئے آزار ہو جائے
مسافر! مفلسی کے سائے میں پلتی ہے خونخواری — جلو میں اسکے دامن تھام کر چلتی ہے خونخواری
بنا دیتی ہے یہ کمبخت رہزن میزبانوں کو — چبا جاتے ہیں بھوکے غیر کیا اکثر یگانوں کو
مسافر! مصلحت سے کام لے اب چھوڑ یہ بستی — خدا جانے ہماری مفلسی کیا رنگ لائے گی

سکوں کا دور اب اس سرزمیں سے جانے والا ہے
ہوائیں کہہ رہی ہیں کوئی طوفاں آنے والا ہے

میراجی

ترغیب

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو
مجھے حدِ احساس سے دُور لیجا رہی ہے

جوانی کا خوں ہے
بہاریں ہے موسم زمیں پہ!
پسند آج مجھ کو جنوں ہے
نگاہوں میں ہے میری نشّے کی الجھن
کہ چھایا ہے ترغیب کا جال ہر اک حسیں پہ

رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے

قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسین اور ممنوع جھرمٹ مرے دل کو پھسلا رہے ہیں
یہ ملبوس ریشم کے اور اُن کی لرزش
یہ غازہ ــــــــــــ یہ ابٹن
نسائی فسوں کی ہر اِک موہنی آج کرتی ہے سازش
مرے دل کو بہکا رہی ہے
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو

حیات اللہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا۔

"ٹکٹ؟"

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دیکر اُسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جاسکتا ہے؟ گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں سہیں، بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا، ایک اسٹیشن سے دوسرے تک پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے —— وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی تو ہوتے جب میں کلکتہ پہنچا ہوں تو کالی پل کھلی تھی۔ اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے

وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے؟ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ـــــــ دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جنکا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے یا پھر شہر سے میلوں دو ٹھیکیدار کی جھونپڑ یا جسکی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی بھی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے۔ بے ایمان حرامزادے۔ ایک وہ سالا تھا بھوندو۔ اور وہ دوسرا اتھا بھورا اور وہ ڈائن بھنگوری جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ وہ ملوں کے مزدور۔ بھائی بھائی ہیں مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لیئے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ ـــــــ جب جیلر نے حکم سنایا ہے کہ "تیری میعاد ختم" تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے بس الکدم سے گھر کی یاد آئی۔ گھر!! کیا چیز ہے!

گھسیٹے کے دل کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی چین ملجائیگا اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آکر گھسیٹے بھونچکا سا کھڑا ہو گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر برابر ریل تک ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آجا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرضکہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں اور اونکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آگیا تب اس کے

دل نے دھڑک کر کہا۔ میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبہ کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا۔ اور دوسرا تقریباً مسلّم زمین پر لیٹا کائی کی مخملی چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے سے اکدم پھڑ پھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں اور کمسن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں۔ وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گئے جب اس مسجد کے گرد برساتی پانی بھر جاتا تھا۔ اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے ننگے نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یونہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یونہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، بقاتی، بلاقی، بتنو، بیولا، سورج بلّی اور وہ کلوا سالا کیا نام تھا اس کا اور کون کون ساری ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سپاریہ مار ڈنڈا اڑاکرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا باغ تھا۔ اس پہ کبھی کبھی لونڈا اِکا دُکا، پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود توڑ توڑ جیبوں میں بھرنے لگے۔ اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آنًا فانًا میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی نکلی جو منتھا منھا گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلّا کر بھاگے پھر کیا تھا سب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ اسے ڈر کے مارے اس کی گھگھی بندھی ہے اور وہ جو لگا ہے فقیرن کے سامنے ہاتھ جوڑنے۔ . . .

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آ گئی تھی اور ہوا میں خوشگوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف تیا ورکے ہرے بھرے جھنڈ تھے جن کے بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہو لنے کی

کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی مینا ؤں اور کوّوں کا شور، کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، بلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو۔ ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوتی تھی۔ جیسے تپا دروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت ہوا آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھوں پر رکھے بیلوں کو ہانکتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ ہی نہیں کی مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آگیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھند لکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور اس نے گھسیٹے کے پاؤں تھام لئے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا! یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی جہنا ایسی دلاری، جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک اور نہ منے کا۔ جب وہاں بیٹھ کر دلاری کا انتظار کرتا تھا تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے! شہر جاؤں گا، نوکری کروں گا۔ دو دو وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائیگا تو واپس آؤں گا۔ اور ہیرا لال کی طرح اک دم سے ایک گوئی بیل لیکر کھیتی شروع کر دوں گا۔ اس وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی! میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آجایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور اور وہاں درخت

کی جڑ پر بیٹھ، گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی، گنگنانے گی، میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسنے گی —— بڑی چڑیل تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو۔ اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا۔ جیسے کوئی بھولی بسری بات ایک دم یاد آ گئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے۔ ہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور اُدھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے گھسیٹے —— کدھر مر گیا؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیئے۔ ان کو اتارو پھر جرابیں اتارو، پھر انگلیوں کو تولیے سے پونچھو، پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو ——

شبن میاں کی چیزیں!! دیکھ دیکھ کتنا جی چاہتا تھا کہ ان میں سے وہ ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا، ایک پھٹا کرتا پے جامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خان صاحب پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دیتیں، پھر پھاڑ لایا؟ اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں؟ یہ کہاں سے کھونچا لگا یا؟ کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی؟ ایک بار شبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیے۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلّانے لگے "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا میں لایا ہوں کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کر د۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں۔ اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں؟

گاؤں میں اِدھر اُدھر ویکتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں لگے تھے دیکھ لیا۔ "تو بشن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا، سونے کا بٹن" دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار چار پیسے پٹہ ملتا ہے۔ جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جس سے دل کو عجیب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دروازے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے۔ جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں۔ ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آ گئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینارے سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بار رات یاد آ گئی جو بیاہ کا جسے لئے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر چڑھی، گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے آ اتری تھی۔

بستیا بھی آ گئی۔ اس کے بعد آبادی سے [illegible] نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور [illegible] لگا بجا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے [illegible] گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اُٹھ کر اماں کا گھر گھر چکی پیسنا اور اس پر گانا "موری چھاگل نہ بولے۔" دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ۔ "اماں روٹی دے۔ اماں روٹی دے" اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔ دودھ کچھ کرو، اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی۔ جب اسکا جی چاہتا اُٹھ کر چولھا جلاتی۔ جھنیا اور شبراتن! اُفوہ دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی وہ بھی دونوں تھیں بڑی ہی حرامزادی کبھی تو کام کرتیں —— اِدھر ابا کلھاڑی کندھے

پڑ کے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلّانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصّہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھائیں دھائیں ——— واہ ری اماں! جہاں کسی کا جی خراب ہوا اور اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے کہ "ارے آ تیرا سر داب دوں" "ادھر آ بخیر گھبراتا رہوں"۔ "چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا"۔ "دونوں وقت ملتے نہ چلّا" "ہر وقت ٹسوا اتار رہی ہے"۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے ——— کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچّے پکّے، سڑے گلے، کھٹے میٹھے جیسے بھی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچّے پکّے امرود۔ جھر بیریاں کیتھے اور کیا کیا سب بہت شوق سے کھاتی تھی۔ مگر بچّوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصّہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق پر رکھدی میں ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں ادھر سے آؤں چرا کے ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابّا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا۔ وہ لگے ڈکارنے "کون کھا گیا"؟ اماں سمجھ گئیں۔ سہولیت سے بولیں "چوہا کھا گیا ہوگا" "تو کھا گئی ہے تو۔ کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں"۔ اماں نے کہا "کیوں؟ کیا ان کے جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو ہی ابا چٹخارے ماریں گے۔ واہ کیا مچا ہے۔ جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون کون ہوگا؟ ابا اماں کیا زندہ ہونگے بستر اسّی برس کون جیتا ہے؟ جمیا اور شبراتن کہیں بیاہی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا جوان ہوگا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہو گئے اور بکریاں؟ اوہ کلّو کے ناتوں کی بھی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب چھوٹی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کیسا میں میں کیا کرتی تھی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بگیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بیتابی سے یہ سوال پوچھا ——— وہ جگہ تھی وہ ——— ہاں ——— وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصّہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا اُس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھما تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چوحدی کی جگہ جھانکڑ دل تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اژدھام تھا۔ جن کے تیلے تپلے ٹیڑھے بیڑے سائے کیچوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بچھا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں تم کو کیا کھلائیں گے۔

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے پچھلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا۔ وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہونگے مگر بار بار بکریوں کی موتت کی کھراہند اور تابدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھی۔ ان بالوں کے گھروندوں کو ڈھا دیتی۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں ایک پلّا رو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھنکارا۔ جواب نہ ملنے پر پھر کھنکارا۔ بار بار کھنکارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے سے بولا۔

"اندر چلی آؤ نا"

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور دب گئی۔ اب کے وہ سہارا لینے کو بیچ بیچ کھنکارا پھر کہنے لگا۔

"کون؟ فقیرا؟"

"ہاں"

فقیرا ذرا چڑ کر بولا

"تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا۔

"تم ہو کون؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا سنو تو بھائی تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں ـــــ کہہ تو دیا"

"تو تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون شخص ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے اُسے خیال تک نہ آیا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا۔

"میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں ـــــ تمہارے پاس"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

"تو اندر آؤ"

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلاوجہ ابھرنے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے نیچے بندھے تھے۔ اُنہیں سے شاید گھرانے کی روزی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک پھٹا ہوا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر اب چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی۔ اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دبلا پتلا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اُس

آخری کوشش

پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھرّیاں، جیسے کچی دیوار پر برکھا میں پانی بہنے کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اُس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"بھیا تم تو جوانی ہی میں بڑھا گئے۔"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

"سچ ہے بھیا۔ بھورا، جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

اب فقیرا کھٹکا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ گھسیٹے تو نہیں ہو؟"

"ہاں گھسیٹے ہیں۔ اور کون بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آتا۔"

بھیا کہہ کر فقیرا اُس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر لپٹا لیا۔ اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے اُس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب اب نہ رو۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے ——" اماں کو دیکھو گے؟"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں

"اماں!! —— ہے کیا؟"

"ہاں"

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اُس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک اِنسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ

گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ انگلیاں بالکل ببول کی روکھی ٹہنیوں
کی طرح تھیں۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ
کر لندے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں ڈھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ،
اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کوئے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت
تھے۔ گال اتنے سوکھ گئے تھے کہ اب ان کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی۔ جو دانتوں
کے غائب ہونے کی وجہ سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر
کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا۔ یہ گوشت ہو یا ورم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے روتے
روتے یہ ورم آ گیا ہے۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ نرخرہ اور ایک ایک رگ الگ الگ نظر
آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے کھینچی ہوئی الٹی نیڈی کی
خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھنی مصیبتوں کی مہر تھی۔ جسے دیکھ کر بے اختیار
دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی۔ اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں
چوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لیجانے لگی۔ جیسے کوئی گونگا کھاتا
ہے۔ بڑھیا نا معلوم کیا کہہ رہی تھی۔ مگر سننے میں صرف یہ آتا تھا "باپ . . . . باپ
. . باپ . . . . باپ . . . باپ . . . . باپ . . ."

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی۔ جہاں کے رہنے
آگ سے جل مرے تھے۔ اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے۔ اور رات
روتے ہیں۔

اپنے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس
"کہ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے۔ پھر بھی مانگے جاتی ہے"
" بڑی کوشش سے بولا

"اماں!"

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا ہے۔

فقیرا: "نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، بات کی آواز نکل رہی تھی اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا۔ مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے۔ اس نے کیسے کیسے اپنا جی مارا! کیا کیا ذرا ذرا سی چیز کے لئے ترستی ہے!

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار اُبل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اُٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اُسے سکون مل جاتا مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دُور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا۔

"بھیا تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو میں کھانے پینے کا کچھ بندوبست کر دوں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار لایا۔ اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس بیٹھ کر بولا:۔

"اتنا آٹا؟ کیا تم نے بھی ابھی نہیں کھایا؟"

"نہیں۔ آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی؟"

"وہ تو کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی۔

دو برس تک ترکاریاں ود کاریاں بوئیں۔ مگر وہ کہیں بکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کا ہے میں پکڑا گیا؟"

"سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا۔ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا "فقیرا مجھ سے تو اب تیری طرح نہ تو بھوکوں مرا جائیگا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائیگا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن عیش تو کرلیں گے" —— دوسرے دن منہ اندھیرے نہ کہیں نکل گیا —— بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"جمیا اور شیراتن کہاں ہیں؟"

جمیا حرامزادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شیراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہو گیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔

ذرا دیر خاموشی رہی پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا۔

"تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ آفتیں آئیں کہ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا جمانا تھا۔ ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب پتلے پیٹ بھرے ہیں پیٹ بھرے" سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری جب چولہا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا۔ اور دہکتے کوئلوں کی طرف اس طرح تکنے لگا۔ جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا۔

"کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

"ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ رہے۔ گھر یاد کر کے کتنی

بار رو تا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں۔ ملوں کی خاک چھانی۔ امیدواری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی۔ ہفتوں قبض رہتا تھا۔ چار سال رکشا چلائی۔ پھر خوانچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے۔ کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو۔ اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو رونے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔"

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پہ رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کھانے لگے۔

فقیرا بولا۔

"بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ۔ اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔"

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا

"تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔"

"ہاں مگر سمجھا نے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے۔ اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے اور پھر باپ، باپ کرنے لگتی ہے۔

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ وہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر پکڑی کے مسکالے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا اپنے میلے کرتے کے چلوے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ جن میں سینکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا۔ جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے تھے۔ جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو لللہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چدروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں تک آگے جھکائے سوں سوں کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ

بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن سے وہ ٹوٹے پھوٹے ویران جھونپڑے، بکریوں کے موت کی کھراہند اور اپنی ماں کی ہائے وائے سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلاتا اور بکریاں چراتا اور رات کو بڑے کی کڑھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! اُفوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے اوڑھنے کو کچھ یا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک گدڑی۔ سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم اور دکھاوا۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانیدار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے۔ اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں۔ دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلوسے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکان کے تختوں پر رات کاٹتا وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سل اور گرمیوں میں دہکتا توا ہوتیں تھیں۔ خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑتا۔ وہ کبھی کبھی تین تین چار چار فاقے کر لیتا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی "سنگل چاء" وہ دھیلے والا پان کا بیڑا! وہ پیسے کی ۲۵ بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے یہاں وہ ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کی جھاڑ جھپاڑ، لات کھائی۔ کھانے پینے کو ترستے رہے۔ پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لئے شہر جانے کی سانس، وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں۔ کہا چلو کلکتہ چلو۔ وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری ہاتھ آ جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا۔ کلکتہ کے پچیس برس! اُفوہ۔ کوئی کوشش اٹھا رکھی؟ میرے پاس رکشا تک چلائی سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو ضمانتی لاؤ۔ میں کیسے لاتا؟

جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ گھرانے کے گھرانے رہتے تھے
جمانتی لے آتے تھے۔ پچھن بولا وہ آئے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائیگا۔ دو آنے
روز اُسے دیے پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اُسے دور ہی سے دیکھ کر
لوگ ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کر کے ایک اچھی سی گاڑی دیدو تو وہ اکڑ کر کہتا
کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال
دوڑے مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بیمار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں
پڑے پڑے مہینوں بیت گئے۔ اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا اب خبردار رکشا
نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگرٹ،
دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا "سیزر لاؤ" "تھیپی کٹ لاؤ" یہ لاؤ۔ وہ لاؤ۔ یہاں
کیا تھا۔ کہتے "نہیں ہے صاحب" نہیں ہے تو مجبوراً وہ بھی تماشا کچھ دنوں تک رہا۔ نہ تو
بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا۔ اس پر جو کچھ آیا بھی حرامزادی بھنگوی کھا گئی
بچاتے ہم سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی۔ . . . لنگوٹی میں پھاگ . . . .

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں
فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑوے پن سے بولا۔

"پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہارا گذارا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا
ہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ ہم
کو روا نہ سمجھنا۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں! بکریوں
میں میرا حصہ ہی نہیں۔"

"گھر میں حصہ، بکریوں میں حصہ۔ تو حصہ بٹائے گا؟ نہ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔
پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے۔ گیا تھا روپیہ کمانے!"

گھسیٹے گرم ہو کر کہنے لگا۔

"کلکتے میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں۔ جو اس کے لیے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

نفیرا نے طعن سے کہا۔

"ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپیہ کے ڈھیر تو لیکر جاتے ہی ہیں۔ تبّی جو اتنا روپیہ لایا ہے کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلّا کر بولا۔

"اور تو نے کیا کر لیا ہے۔ چوٹٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں۔ اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا۔ سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا۔ . . ."

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے کیا کرے جو فقیرا کو اپنی بات کا یقین دلا دے۔

کچھ دیر یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔ یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا۔ بلکہ پورے چار مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اُٹھتا۔ روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی یہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لیے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آ جاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی اُمنگوں کو سکھ دے لیتا

چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو۔ دوارے بھینس بندھی ہو۔ کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلّو سے تھالی صاف کرے۔ اس میں دال بھات لاکر سامنے رکھے۔ اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے ہوں۔ جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں۔ جیسے شرمائی سالی کا سر۔ مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو۔ دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان! چالیس کا سن ہونے کو آیا . . . . .

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور رہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آجائے . . . .

ایک زبردست امنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا۔

"بھیا فقیرا!"

فقیرا پیار کی پکار سُنکر فوراً پاس آگیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو کھسیٹے بولا۔

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ میں اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں۔ یہ کریں وہ کریں۔ سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟"

کھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات پوری نہیں ہوئی ہے۔ پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں وہ تو تم مانتے

ہی نہیں ——— اس میں تمہارا بھی بھلا، ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہونگے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو۔ اُن کے گھر ہُن برس رہا ہے ہُن۔ کہنے کو ہم شریف اور رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا ادھار دیدو۔ دو کنکڑیاں نمک دیدو۔ ذرا سی تمبا کو دیدو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں۔ دھتکار بھی دیتے ہیں مگر پھر ہم جاتے ہیں۔ نجائیں تو کیا کریں؟"

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا۔ گھسیٹے دم لیکر پھر کہنے لگا۔

"اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں۔ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔"

گھسیٹے نے ایک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا۔

"ہاں تمہارا سادی بیاہ کرنا ہے۔ روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔ ارے ہاں اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے۔ اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے جب پیسے ہوں گے تو اُن کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔"

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر تب انہیں سن کر فقیرا کو غصہ آگیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا۔ اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا۔ شریف پھول کا برتن ہے۔ جتنا بھی کیچڑ میں سو نذ جائے جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے۔ اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ ماناجو گیوں کے پاس روپیہ پیسہ ہے۔ گھر گرستی ہے۔ ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں۔ وہ نہیں کرتے ہم ہی اُن سے روٹی ادھار مانگتے ہیں مگر اس سے کیا، ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ابھی ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ

دوزخ بن میں ۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہوگئی۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کما کر ٹھیک نہیں لوٹا۔ اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے؟ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی دل لگی کر لو اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے، روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے، آس جگانے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا، تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اٹھی' اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کل کی کوئی فکر نہ تھی۔ آج جو بابا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے۔ ذرا یہ چھپر بدل جاتا۔ تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں۔ اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے۔ پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا؟ وہ رمضانی کی بیوہ۔ آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے۔ اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے۔ کیسا گدرایا گدرایا بدن ہے! جیسے پکا آم کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دودھ وہ دوہے۔ اوپلے وہ پاتھے۔ دہی وہ متھے۔ اکیلی چھ دو ٹن پانس اٹھا اٹھا کھیتوں میں وہ ڈالے۔ کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لیگا۔ اور پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے وہ رمضان کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکیارگی پیچھے سے آگئی۔ اسے بھاگتے نہ بنی۔ کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا۔ یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اُٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا۔ اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھا لیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب۔ باب۔ باب کرکے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اُسے چھوا تھا۔ اُسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اُس کا چہرہ عجیب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ اور دوسری طرف بدن کے رونئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اُسے لیجا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشہ کا برتن ہو ٹوکرے میں رکھ دیا اور چیتھڑوں سے اُسے ہر طرف سے چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں۔ شاید کچھ ایسا محسوس کیا جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپاتے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آ گئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کے چلنے لگی۔ یہ خوش تھے۔ کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا۔

"کہاں چلے فقیرا؟"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اُس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اُٹھا۔

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں۔"

اماں کو لئے اِکسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا۔
"شاباش تم لوگوں کو ——— اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

جس وقت شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہوا تھا، ان لوگوں نے مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک گلی میں آکر ڈولی رکھی اور گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ اور پھر اُس کے کانپتے سیدھے ہاتھ کو ٹوکرے کے آر پار ایک چیتھڑا باندھ کر اُس پہ رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ باپ کرتے وقت ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیونکہ دس برسوں سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اس سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باپ باپ کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلّانے اور کھانا مانگے۔ جیسے بٹھائی گئی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بڑی رہی ساری کی کرائی پہ پانی پھرا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دوکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرہ مانگا۔ اس نے تھال پر چمٹی ہوئی بڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا۔ اور جتنا شیرہ ابھر آیا اُسے انگلی سے پونچھ پونچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اُس نے لا کر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اُس کا چٹانا تھا کہ فوراً باپ باپ کرکے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آگئی۔ گھسیٹے نے پتہ قنبیرے کو پکڑا کر ہدایت دی کہ موقع پہ بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ قنبیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو چکا تھا۔ عقل چندھیا گئی

تھی۔ اُس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آگئی تھی۔
گھسیٹے مشتاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے۔ اور فقیرا
نوسکھیے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ کر سہما جاتا ہے۔ گھسیٹے فقیرا کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل
کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ یہاں فقیروں کی بھیڑ لگی تھی۔ دیہات
کے گھروں کے سامنے جس طرح کوڑے اور پالنس کا ڈھیر ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کے
گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر تھا۔ کٹی ہوئی انگلیوں اور بیٹھی ہوتی ناک والے
کوڑھی۔ نتھا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں چیتھڑے چیتھڑے نیچے جنکے
ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے، جو نجانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے
پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پہ جوؤں کا جنگل اور بدن پہ میل
کی کسہکل چیتھڑے، ٹھیکرے، میل آخور، بلغم، ناک، پیپ بھرے ناسور، مکھیاں، گھناؤنے
جراثیم، دغا فریب، جھوٹ۔ ذلیل سے ذلیل، گندی سے گندی حرکت۔ اور ان سب کو
ڈھانک دینے والی لوریاں دے دے کر، تھپک تھپک کر، سلا دینے والی مہا پاپن
بے حسی!

——— اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا میل
کچیل ہو چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو چاہے انسانیت ہو۔ بابا کے مندر کو یہی راستہ جاتا
ہے۔ اس وقت جبکہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور
سیدھا راستہ، تمہارا رستہ ——— پھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا۔

"اِسے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے"

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی
دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس

جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر وہاں سے ٹلنا چاہا۔ مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اُس نے سن کر دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا۔

"تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے۔ مگر بڑھیا اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کی لالچ میں دوڑا جا رہا تھا ان کو ڈانٹا۔

"چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے کسی نہ کسی وجہ سے خاموش ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا جذبہ ان لوگوں میں نہیں تھا۔ اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شہرا چٹا دیا۔ شہرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی۔ اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اُسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو گود میں لئے کھڑا تھا سہم کر زور سے چیخ ماری۔ اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں ٹوا لئے ادھر سے گذر رہی تھی۔ اُس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسا ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اور چند ہی برسوں میں چھاپ بیٹھے گا۔ اُس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جُٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اُس کے ہاتھ میں تھوڑے دیگا۔ دیگا بڑھیا کو۔ اُس کے سامنے کوئی چادر ہونا چاہئے جس پہ

آکر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا پھٹا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ایک بڈھا دردناک آواز میں چلّانے لگا: "بھوکا ہوں بابا!" ایک فقیرن یوں گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک لنگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ آوازیں لگانے لگا "جب دیگا اللہ ہی دیگا۔" فقیر بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھوچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور تشیر اچھپانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے اُسے چلّا چلّا کر کئی بار کہا۔ جب نہیں سُنا تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چھپا دیا۔ تشیر کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اُس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی ہی میں اُس کے منہ سے نکلا: "اللہ ہر آفت سے بچائے" اس صدا کو اس طرح دینے لگا جیسے کوئی والنٹیر انقلاب زندہ باد کہے۔ کوئی دوسری لے اُسے یاد ہی نہ آئی۔ اُس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ اُدھر دیکھ لیتے تھے۔ دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ دردانگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا۔ جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ، یا ایک ایک دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا جیسی کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اُس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اُس کا اچھا سامان ہو۔ اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو۔ مگر آج دونوں نعمتیں میسّر آگئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں۔ اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے

کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک! اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ جیلے روزی بہانے موت۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے۔ اس تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے گا رہے تھے۔ اور زور زور سے ہنس ہنس باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتاری۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے۔ دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کو گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں بہت سی تیل کی پوریاں کئی قسم کی ترکاریاں۔ سیر بھر پنچ میل مٹھائی۔ چٹ پٹے کباب مولیاں اور بیڑی کا بنڈل تھا۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپیہ ملے تھے جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچک رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں تک چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں کا کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا اتنا ڈھیر تھا۔ جو تھا اپنا تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے۔ پھر مر بھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی ایک ایک پوری کا ایک نوالہ۔

کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شوق سے

ڈھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی۔ اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اُسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

"لو آج تم بھی مزیدار چیزیں کھالو کبھی کا ہیکو کھایئں ہونگی۔"

گھسیٹے نے کچھ ٹکیاں اس کے منہ میں دیدیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بے حد بدحواسی سے باپ باپ کرنے لگی۔ حیرت کی بات یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا ڈلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی کہ ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھرلے فقیرا اور گھسیٹے کے لیے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اُسے کھلائیں۔ اِدھر اُس کے منہ میں کچھ دیتے اور اُدھر وہ نگل کر اور مانگنے لگتی۔ گھسیٹے جھلا کر بولا۔

"تو تم بھی کیا یاد کروگی۔"

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دیدیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اُسے چبانے لگی مگر چبانا کیا وہ بار بار منہ سے نکل نکل آتا۔ اور یہ پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اُسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اُس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اُسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اُس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اُسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اُسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اُسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا۔ اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی۔ وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھوڑی با چھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں پر بہہ

رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری ملیٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا۔ مگر ماں کا باپ باپ تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہیں رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی۔ چلاتی رہی اور آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اُس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اب اُس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پُتا چولھا تھا۔ جیسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لیئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوی جلدی جلدی گرما گرم موٹا سُرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے تھالی میں دگھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آگئی ہے، ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے۔ . . . فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی بھی کامیابی! پونے دو روپیہ!! اور صرف ایک دن میں!! پچاس روپیہ مہینہ!!! اُفوہ!! اگر کہیں ہم کلکتہ میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! اسنگل چاء بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں۔ وہ اُن کا مٹک مٹک چلنا۔ گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر تک انہیں خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصہ مانگا تو سسرا اکڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بنائے گا۔ . . . نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر دیدوں گا۔ بکریاں دیدوں گا۔ مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اُس کا لڑکا ہوں۔ اور اب فقیرا کا

حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی۔ آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو مار دوں گا۔ سر پھوڑ دونگا حرامی سالا فقیرا!

گھسیٹے سوچ سوچ کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اُس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا:

"فقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ کر لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہیئے۔"

"کاہے کا حصّہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصّہ بانٹ۔ ارے گھر کا۔ بکریوں کا۔ اور جو کمایا ہے سب کا۔"

فقیرا تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر۔ پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا؟"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا شہر سے نکلتے ہی وہ پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصہ میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔

"اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دیدو اتنے دنوں ان کو اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔"

"ہاں اب تو تو کھلائے گا ہی؟ پندرہ برس میں اس کا پیٹ پالتا رہا۔ گو موت کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی۔ اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے؟ تجھے دیدوں؟ مجال ہے تیری کہ تو لیجائے۔"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصہ میں ماں کی طرف لپکا جیسے اُس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا۔ فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارا حد سے اونچا ہو گیا۔ اُس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح

ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھڑی ہے جس طرح بلی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اُس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عو عو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی۔ بنجا نے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اُسے خود ہی چھوڑ دیا مگر فقیرا جیسے ہی اُس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اُس پر پھاند پڑا۔ وہ ترڑے کھڑے قد سے نیچے گر پڑا اور بڑھیا چیختی قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ سے اُس کے سینے اور منہ پر گھونسے مارنے لگا گھسیٹے جیسے گھونسے کھاتا جاتا ویسے ہی ویسے اور زور سے گلا دباتا جاتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے دئے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے فلّوں کی طرح باہر نکل آئے۔ منہ بہت بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بے رہ گئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اُترا اور اُسے اندازہ ہوا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا۔ اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اُس کا چہرہ رام لیلا کے بیجا کی طرح ہونق اور غیر انسانی ہو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لئے پہلا قتل نہیں تھا جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اُس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کس کو پروا ہوتی ہے؟ مر گیا مر گیا۔ ہا — فقیرا — ناحق مرا — مان لیتا میری بات میں نے کیا بُرا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی اب مجھے دیدو۔ ادے یار میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھوں میری تو جان ہے مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا۔ جیسا کیا ویسا بھگتا۔

× × × × × × × × ×

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو ـــــ پیاری اماں۔ کلکتہ۔ وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملیگا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا۔ دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ مٹی کے چھوت کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منہ تکیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے نکتیاں، گلاب جامن۔ پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے ـــــ لوندے کے لوندے۔ زرد زرد چھپن گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا ـــــ بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ کالی بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔ پت جھڑ ہوا کے جھکڑ سینکڑوں میل سے کروڑوں درختوں کو تاراج کرنے مردہ پتوں کو اٹھا اٹھا کر ٹپکتے، وحشتناک سُروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ درختوں کی طرح یہ ہر چیز کو اڑا لیجائیں گے۔ گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اُس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ ان ہی دونوں کے بیچ میں اُس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اُس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اُس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اُس کی یاد کلکتہ کی بے کسی کی زندگی میں بھٹکے مسافر کا ایک دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا سے رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چلی ہے۔ پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آگیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا۔ مگر ابھی وہ خود اس کے قابل نہیں بنا تھا ـــــ امید کی آخری [illegible] ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے۔ اور

پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔ جب تک زندگی ہے جینا ہے مگر اب اس سمندر میں پیرنا نہیں بلکہ بہنا ہے۔ وہ جدھر چاہے بہا لیجائے جس طرح چاہے بہا لیجائے۔ اور جب چاہے ڈبو دے۔

مہینوں بعد کا قصہ ہے کہ گھسیٹے اسی شہر میں بھیک مانگتا ہو دیکھا گیا جب کوئی اپنے گاؤں کا اُسے مل جاتا تو وہ سب کی خیریت پوچھتا۔ وہ بالکل پرانا گھسیٹے تھا سوائے ایک بات کے وہ اکیلی بات یہ تھی کہ اب وہ خوش رہتا تھا۔ کیونکہ اب اس کے پاس طرح طرح کی دولتوں کے گٹھر بنتے تھے۔ جن کو وہ کھوپڑی پر لادے اور بغل میں دبائے ہر جگہ لئے لئے گھومتا تھا۔ یہ ایسے خزانے تھے جن کے کمانے کے لئے نہ تو کسی ساز و سامان کی ضرورت تھی نہ کسی فن کی۔ نہ کسی تجربے کی اور نہ اپنے کو کسی رنگ پر ڈھالنے کی۔ ان کو نہ دشمن چھین سکتا تھا اور نہ دوست چرا سکتا تھا کبھی کبھی یہ اپنے خزانوں کو کھول کر اپنی نعمتوں کو سجا کر ان کی ستائش کرتا تھا۔ ردّی کاغذوں کے ڈھیر ایک طرف لگاتا۔ شیشے اور چینی کے ٹکڑوں کے ڈھیر ایک طرف سگریٹ اور دیا سلائی کی خالی ڈبیوں کے ڈھیر ایک طرف۔ چیتھڑوں کے ڈھیر ایک طرف۔ زخموں کی پٹیاں اور پھاہے جو اسپتال سے چھنی گئی تھیں۔ ایک طرف۔ پھر اپنے کو اتنی دولت کا مالک پاکر اس کا دل خوشی سے بھر جاتا اور وہ زور زور سے قہقہے لگاتا ؛

نیا ساز، نئی تان

شدتِ غم میں بیکار ہے مرنا میرا
زندگی سے تجھے نفرت ہی سہی
موت پیغامِ مسرت ہی سہی
ڈوب مرنے سے بہتر ہے اُبھرنا تیرا

قافلے رات کی ظلمت میں بھٹک جاتے ہیں
لیکن ایسی بھی اِک آتی ہے گھڑی
صبح کا مست گجر بجتے ہی
پردہ ہائے شبِ تاریک سرک جاتے ہیں

•

جم چکا ہے ترے احساس پہ صدیوں کا غبار
چہرہ روشن ہے مگر رنگ نہیں
دھڑکنیں دل کی ہم آہنگ نہیں
ہے جوانی تری ناکام امنگوں کا مزار

•

تیرے ماحول پہ طاری ہے تعیش کا جمود
حسن کو حسن فروشی کا جنوں
عشق پر جلوۂ عریاں کا فسوں
شعلہ ناپید ہے، باقی ہے مگر پردۂ دود

•

شبِ تاریک میں تو پھرتا ہے آوارہ سا
جب بہت دور درختوں کے تلے
کوئی بھٹکا ہوا جگنو چمکے
قلب میں تیرے دہک اٹھتا ہے انگارہ سا

•

جب کبھی رقص کے گونجے ہوئے ایوانوں میں
سرسراتے ہوں حریری ملبوس
جگمگاتے ہوں سنہری فانوس
بھوت سرگوشیاں کرتے ہیں ترے کانوں میں

موڑیں جب تیرے پہلو سے نکل جاتی ہیں
چھوڑ کر تند بگولوں کی قطار
پھینک کر رُخ پہ ترے گرد و غبار
بجلیاں سی ترے سینے میں مچل جاتی ہیں

•

جب کسی محل سے سمٹی ہوئی باہر آئے
کوئی افلاس زدہ دوشیزہ
اپنی عصمت کو کئے صد پارہ
پھیل جاتے ہیں ترے قلب پہ غمگیں سائے

•

مسجدیں چند دکھاوے کی نمازوں کے مقام
دیر میں مورتیاں ہیں حیراں
بنسی والے کے پجاری ہیں کہاں
قحبہ خانوں میں کھنکتے ہیں مگر جام سے جام

•

ایسے جینے سے تجھے موت کا جنگل ہے پسند
زندگی اب تیری گمراہ سی ہے
تیری ہر سانس میں اک آہ سی ہے
ٹوٹ جانے کو ہے اب تیری امیدوں کی کمند

لیکن اب روحِ زمانے کی ہے طوفاں بکنار
کٹ کے گِر جائیں گے بجر وبر پہ
اندھے بوسیدہ عقیدوں کے سَر
کون کہتا ہے کہ بھرپور نہیں وقت کا وار

•

اپنی مایوس جوانی کی کہانی نہ سُنا
یہ حزیں عہد ہے جانے والا
اِک حسیں دَور ہے آنے والا
اب نئے ساز کی آمد ہے نئی تان اُٹھا!

•

حجّاموں کی یونین

جدید ہندوستان کی تعمیر میں ہمارے گاؤں کے چندو حجام کا بھی بڑا حصہ تھا۔ ضرورت ہے کہ میں اس کی تاریخی خدمات کی طرف توجہ دلاؤں، ورنہ ممکن ہے دنیا اسے فراموش ہی کر دے۔ اس نے ایک عظیم الشان کارنامہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ دنیا کو حق شناسی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ عجیب وغریب کارنامہ کچھ اس قسم کا ہے کہ شروع میں خود چندو بھی اس کی پوری پوری اہمیت سے واقف نہ تھا۔ اس وقت وہ ہندوستان کے دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح اپنی اہمیت کو بہت زیادہ نہیں خیال کرتا تھا۔ لیکن قدرتاً جو خود پسندی بڑے آدمیوں میں ہوتی ہے۔ وہ اُس میں بھی آگئی تھی۔ یہ خود پسندی اسے بُری بھی لگتی تھی۔ اور اسے زیب بھی دیتی تھی۔

میں چندو کو ان دنوں سے جانتا ہوں، جب وہ ایک پھٹا ہوا کرتا تھا۔ یہ کرتہ پھٹا ہوا بھی کچھ اس طور سے تھا کہ بمشکل اس کا ننگا اور پھولا ہوا پیٹ ڈھکتا تھا۔ ہم اکٹھے

گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ میں کھیلا کرتے تھے کبھی سپاہی بنتے تھے، کبھی دوکاندار اور کبھی کلرک ان کے علاوہ اور بھی کئی کھیل تھے، جو ہم نے اپنی تفریح کے لئے ایجاد کئے تھے۔ اس تفریح میں اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا۔ ہاں البتہ ہماری مائیں کبھی کبھی آکر دیکھ جاتی تھیں۔

چندو مجھ سے کوئی چھ ماہ بڑا ہوگا۔ ساری باتوں میں وہی پیش پیش رہتا تھا۔ میں بھی بخوشی اس کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ چونکہ اسے بھڑ پکڑنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ بھڑ کی دم کو دبا کر بڑی ہوشیاری سے ڈنگ نکال لیتا اور پھر اس کی ننھی ٹانگوں سے تاگا باندھ کر اڑاتا تھا لیکن میں جب کبھی کوئیں کے منڈیر کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں پر سے بھڑ پکڑنے کی کوشش کرتا، تو مجھے ضرور سزا بھگتنا پڑتی بھڑ اکثر میرے گالوں پر کاٹ لیتی تھی۔

ہم کچھ بڑے ہوئے تو پھر بھی ویسے ہی چندو مجھے دنیا بھر کی خوبیوں کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا اب تو وہ قسم قسم کے کنکوے بھی اڑا لیتا تھا۔ ان کنکووں کا توازن کچھ اس ڈھب کا ہوتا تھا کہ انہیں قابو میں رکھنا میرے بس کی تو بات نہ تھی۔

اسکول کے کام کاج میں وہ مجھ سے پیچھے تھا۔ وہ میری طرح سوال نہیں نکال سکتا تھا وجہ یہ تھی کہ اس کے پتا نے اسے شروع ہی سے آبائی پیشہ سکھا دیا تھا۔ اور لوگوں کی حجامت بنانے کے لئے اس کو گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ اسکول کا کام کرنے کے لئے اس غریب کو وقت ہی کہاں ملتا تھا لیکن اسے گیت بہت یاد تھے۔ اس فن میں وہ مجھ سے بہت بڑھا ہوا تھا اسے نہ صرف یہ کہ کتاب کے سارے گیت ازبر یاد تھے۔ بلکہ وہ نثر کے صفحے اس شان سے زبانی سنا دیتا تھا کہ وہ سب گیت ہی معلوم ہونے تھے۔

امتحان ہوا۔ چندو نے وظیفہ حاصل کیا۔ ماتا جی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی، کہ اس کو تو اسکول سے کچھ نقد بھی ملے اور میں فیس پاس سے دیکر تعلیم حاصل کروں۔ اب وہ مجھے چندو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں کہتی تھیں چندو ایک حجام کا بیٹا ہے اور کمین ذات کا ہے اور یہ بھی کہتی تھیں کہ مجھے اپنی ذات اور مرتبے کو پہچاننا چاہیئے۔ میں نے اپنے والدین

سے اور کوئی باطنی اوصاف تو حاصل کیئے ہونگے لیکن برتری کا کوئی احساس یقیناً ورا ثت میں نہیں پایا تھا۔ مجھے تو اس سُرخ نشان سے بھی شرم آتی تھی۔ جو ماتا جی صبح کو میرے ماتھے پر لگایا کرتی تھیں۔ چیست اچکن، سفید لٹھے کا پاجامہ، سنہری طلا کا جوتا۔ سلک کی پگڑی غرض کہ مجھے ایسی کوئی چیز نہیں بھاتی تھی۔ چندو جو کپڑے پہنتا تھا کچھ عجیب سے ہوتے تھے۔ ان میں شکن بھی ہوتے تھے اور چیچے چیچے بھی رہتے تھے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ مجھے بھی حق ہونا چاہیئے کہ چندو کی طرح کپڑے پہنوں ـــ ایسے کپڑے جو وضع داری سے بے نیاز ہوں۔

چندو نکر پہنا کرتا تھا جو اُسے ایک پنشن یافتہ صوبیدار نے دی تھی۔ اُس کی قمیص کے اوپر ایک مخمل کی واسکٹ بھی ہوتی تھی۔ جو سیپ کے بٹنوں سے سجی ہوئی تھی۔ وہ ایک گول نمدے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتا تھا۔ یہ ٹوپی کبھی ہمارے گاؤں کے وکیل لالہ حکم چند جی کے سر کی زینت ہوا کرتی تھی۔

چندو کے پتا پلیگ کی بیماری سے اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان کے چندو بالکل آزاد ہو گیا۔ جو جی میں آتا تھا کرتا تھا۔ اس کی آزادی قابلِ رشک تھی۔ صبح ہی صبح وہ اونچی ذات کے شرفا کے گھروں میں جاکر ان کے سر اور خط بنایا کرتا تھا۔ پھر خود نہا دھو کر اپنے کپڑے پہن لیتا تھا۔ اتنے میں لالہ حکم چند جی کی گاڑی تیار ہو جاتی تھی۔ اور وہ بھی وکیل صاحب کے ساتھ پائیدان پر بیٹھ کر شہر کو چل دیتا تھا۔ یہ شہر گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

چندو مجھ پر بڑی نوازش کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ مجھے شہر جانے کے بہت کم موقعے ملتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ تین میل تک جوتیاں چٹخاتے، خوفِ خدا دل میں لیئے ہوئے چودھیالہ کے مڈل اسکول میں پہنچ جاؤں اور کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ اس نے پتا کی وفات کے فوراً بعد ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور بے رحم استادوں کی زد و کوب سے بچ گیا تھا۔ وہ میرے لیئے شہر سے رنگ بھرنے والا برش، سنہری روشنائی، سفید چاک، پنسل تراش، جس میں دو طرفوں والا پھل لگا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے اور بھی کئی تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ

مجھے متمدن دنیا کے بازاروں کی مختلف النوع چیزوں کی تفصیل سنایا کرتا تھا۔ اس مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ واپسی پر اُسے پھر وکیل صاحب کی گاڑی کے پائیدان پر آنا ہوتا تھا۔ اِس لئے اُسے کچہری میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پر وہ اکثر صاحب لوگوں، وکیلوں چپراسیوں اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اور اُن کی انگریزی وضع قطع کی پوشاک پر دل کھول کر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے دو ایک مرتبہ مجھ پر یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ وہ اپنے گھر کے مٹکے سے کچھ رقم اڑا لے۔ یہ مٹکا گویا ان کا دولت خانہ تھا۔ جہاں جنیدو کی ماں اس کی پیشہ دارانہ چابکدستی سے حاصل کی ہوئی مزدوری کو جمع رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اِس رقم سے کلام خان کا سا ساز و سامان خرید لے یہ کلام خان شہر کے دندان ساز تھے جنیدو کہا کرتا تھا۔ یہ خان صاحب لوگوں کے منہ میں دانتوں کی قطاریں لگا کر اور مصنوعی آنکھیں جما کر معجزہ ہی تو کر دیتے ہیں۔ کلام خان کا حلیہ اس نے اس طرح بیان کیا تھا۔ وہ ایک آدمی ہے بالوں میں ایک طرف کو چیر نکالتا ہے۔ مادے سے سخت کی ہوئی قمیص پہنتا ہے۔ اس کے اوپر گلے میں ایک ہاتھی دانت کا سا کالر ہوتا ہے اور اس میں ایک بوٹائی لٹک رہی ہوتی ہے۔ ایک سفید رنگ کا کوٹ ہوتا ہے۔ نیچے ایک پٹی دار پتلون اور سیاہ رنگ کا پمپ شو، اور یہ پوشاک جو وہ کام کرنے کے وقت پہنتا ہے۔ ربڑ کی بنی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ جادوگر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے چمڑے کے بیگ کو کھولتا ہے اور اپنے چمکدار لوہے کے اوزاروں کو بڑے طمطراق کے ساتھ باہر نکالتا ہے۔ پھر جنیدو نے اِس مسئلے پر میری رائے دریافت کی کہ کیا وہ حجام جس کے پاس پرائمری کی سند بھی موجود ہو۔ اگر کلام خان کا سا لباس پہن لے تو زیادہ معزز نہیں بن جائیگا؟ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا۔ اگرچہ میں نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن اِنسان کے جسم کے اوپر جو کیل، پھنسی، پھوڑے، وغیرہ نکل آتے ہیں ان کا علاج تو میں بھی جانتا ہوں میں نے اپنے پتا جی سے سیکھا تھا۔ اور اُنہوں نے اپنے پتا جی سے یہ تعلیم لی تھی۔

میں نے اُس کے اِس منصوبے کی تائید کی۔ اور پرجوش انداز میں اُس کی حوصلہ

افزائی بھی کی۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح ہمارے ہاں آیا۔ اسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں جذبات کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ ایک ربڑ کا کوٹ زیب بدن تھا اگرچہ یہ کچھ بڑا تھا۔ لیکن تھا بڑی ٹھاٹھ والا۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کا ایک پمپ شو تھا، اتنا چمکدار کہ اُس میں مجھے اپنا چہرہ صاف صاف دکھائی دیتا تھا اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا بیگ تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے چکر پر نکلا تھا اور مجھے دکھلانے آیا تھا کہ وہ اپنے اس نئے ساز و سامان سے کتنا پارعب ہو گیا ہے!

اُسے دیکھتے ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "عجیب! عجیب!"

وہ زمیندار کے گھر کی طرف جس کا خط وہ ہر روز بنایا کرتا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ میں بھی اس کی داد دیتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس وقت گلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ تنہا میں ہی اس کی شان و شوکت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے لباس میں ملبوس تھا۔ خود شناسی میں محو، گاؤں کی دیواروں کے اوپلوں سے اپنی پوشاک کو بچاتا ہوا اور غلیظ پانی سے ہٹتا ہوا، جو گاؤں کی گلیوں میں اکثر بہتا رہتا ہے۔ چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی کہ ہم زمیندار کے گھر میں داخل ہوئے ہمیں دیوی ملا۔ یہ زمیندار کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر تالیاں بجائیں اور کہا چندو آیا! چندو آیا! کسی مشن اسکول کے پادری صاحب کی طرح خوبصورت اور شاندار کپڑے پہنے ہوئے۔

موٹی توند والے زمیندار بیچے چند نے اپنا ہاتھ پونتر جنیو پر پھیرتے ہوئے کہا: رام! رام! "یہ جنیو اس کے کان پر سے لٹک رہا تھا۔ چونکہ وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگا: یہ سور کہیں کا! ہمارے گھر میں گھستا آ رہا ہے چمڑے کا بیگ لیے اور کسی جانور کے نہ جانے کس جانور کے گودے کا بنا ہوا کوٹ اور منحوس کالا انگریزی جوتا پہنے چلا آ رہا ہے۔ نکل! دور رہو! شیطان کے بچے، تم ہمارے دھرم کو بھرشٹ کر دو گے۔ پتا نے آنکھیں بند کیں تو ایسا ہو کہ دنیا میں کسی کا بھی ڈر نہیں؟"

چندو کہنے لگا: لیکن جاگیردار صاحب! میں نے تو ایک ڈاکٹر کا لباس پہنا ہوا ہے۔"

"سور کہیں کا! نکل یہاں سے! جا اور وہ کپڑے پہن جو ایک نیچ ذات حجام کو زیب دیں۔ اپنے ان نئے نرالے خیالات سے ہاتھ اٹھا ورنہ ڈنڈوں سے تمہاری تواضع کی جائے گی۔"

چندو نے عرض کی "لیکن لالہ جی چندجی . . . "

"چلے جاؤ، چلے جاؤ! مجھے کہیں کے قریب مت آنا ورنہ ہمیں گھر بھر کو گنو کے گوبر سے پوتر کرنا ہوگا۔"

چندو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہاں سے واپس ہو لیا۔ کچھ یہی حال اس بھی ہو رہا تھا۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ اس کی توہین ایک ایسے شخص کے سامنے ہو رہی تھی جو اسے ایک برگزیدہ ہستی خیال کرتا تھا۔ پھر وہ بڑھتا ہوا تھا نورام کی دوکان کی طرف چلا گیا۔ یہ صاحب گاؤں کے ساہوکار تھے اور گلی کے موڑ پر پنساری کی دوکان کرتے تھے۔

زمیندار کا لڑکا دیوی اپنے پتا کے اس سخت سلوک کو برداشت نہ کر سکا۔ اور شور و غل کرنے لگا۔ میں اس کو خاموش کرانے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس کے بعد جب میں گلی کے سرے پر آیا تو دیکھا کہ وہ ساہوکار صاحب چنے تولنے کے لئے ہاتھ میں ترازو لئے ہوئے ہیں اور چندو غریب کو بے نقط سنا رہے ہیں۔ "سور! تمہیں چاہئے تھا کہ پتا کے مرنے کے بعد اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے اور اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرتے نہ یہ کہ کسی بھانڈ مسخرے کی طرح رنگ رنگ کے سوانگ بھرتے پھرتے ہسپتال کے لوگوں کے سے ناپاک کپڑے پہن کر پھر رہے ہو۔ جاؤ اور اپنے کپڑے پہن کر آؤ۔ ورنہ میں تم سے خط نہیں بنواؤں گا۔"

ساہوکار صاحب جوش میں یہ لعن طعن کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے چوٹی کی مقدس گانٹھ پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔

چندو بہت دل برداشتہ ہو گیا۔ غصے میں آ کر میرے پاس سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گویا کہ اس سارے افسوسناک حادثے کا میں ہی ذمے دار تھا۔ مجھے بے حد تشویش تھی میں اس سوچ میں تھا کہ چندو مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی اونچی ذات سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں نے پیچھے سے بلند آواز میں کہا "پنڈت پرمانند جی کے پاس جاؤ اور کہو جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں غلیظ نہیں ہیں۔"

پرمانند جی کو زمیندار نے بلا بھیجا تھا کہ فوراً اس ناپاک مسئلے پر بات چیت کر لی جائے میں نے یہ کہا ہی تھا کہ پرمانند جی زمیندار کے گھر سے نکلتے ہی کہنے لگے۔ "اچھا! تو تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔ اسکول کی تعلیم نے آج کل کے لڑکوں کا ستیاناس کر دیا ہے تم یہ لباس پہن لو تو مناسب بھی ہے۔ چونکہ تم بڑے ودوان بننے والے ہو۔ لیکن اس نیچ ذات کے لڑکے کا اس لباس سے کیا واسطہ تھا۔ وہ ہماری ڈاڑھیوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ سروں کو چھوتا ہے اور ہمارے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتا ہے۔ پرماتما نے پہلے ہی سے اسے ناپاک بنایا ہے اب وہ اور زیادہ ناپاک کیوں بنتا ہے۔ تم اونچی ذات کے ہونہار ہو اور وہ نیچ ذات ملیچھ ہے۔"

چندو نے بھی یہ باتیں سن لی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں غصے میں بھاگتا ہوا چلا گیا۔ ایسے کہ اسے کوئی اشد ضروری کام آن پڑا ہو۔

میری ماتا مجھے کہہ رہی تھیں۔ "بیٹا! اب تمہارے اسکول جانے کا وقت ہے۔ کھانا کھا لو اور اسکول جاؤ۔ ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی۔ موقع تو مل ہی گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مجھے اس حجام لڑکے سے میل ملاپ نہ رکھنے پر لیکچر پلانے لگیں۔

چندو کی شامتِ اعمال نے سارا دن مجھے بے چین رکھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ جب میں اسکول سے واپس آیا تو اسے وہاں سے بلانا چاہا۔ اس کی ماں مشہور زباں دراز عورت تھی۔ چونکہ وہ اونچ ذات کی بہو بیٹیوں سے جا ملتی تھی اور بے تکلفی کے ساتھ کہ وہ شاید آپس میں بھی اس طرح سے ملتی ہوں گی۔ اس سے اس کو کافی جرأت ہو گئی تھی۔ لیکن مجھ پر وہ ہمیشہ سے مہربان تھی۔ اب کچھ طنز آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ کیوں نہ ہو پورے ساٹھ سال کی ذلت اور رسوائی کوئی برداشت کرے تو اس کے لب و لہجے میں طنز آ ہی جاتی ہے۔

"ہاں تو تم آ گئے۔ تم یہاں اپنے دوست سے ملنے کے لئے آتے ہو گے۔ اگر تمہاری ماں تمہیں یہاں دیکھ پائیں تو میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ کہ میری نگاہیں تمہارے خوبصورت چہرے پر کیوں پڑیں۔ تم ایسے ہی بھولے بھالے ہو جیسے کہ نظر آتے ہو۔ یا کہ تم بھی اپنے بھائی بندوں کی طرح چھپے ہوئے بگلے بھگت ہو۔"

میں نے اس سے دریافت کیا "اماں چندو کہاں ہے؟"

اب اس نے قدرے مخلصانہ لہجے میں کہا۔ بیٹے! میں نہیں جانتی ہوں کہ وہ کدھر کو نکل گیا ہے۔ شہر ہی کی طرف کہیں گیا ہو گا۔ کہتا تھا سڑک پر کچھ آدمیوں نے حجامت بنوائی تھی اور اُن سے کافی پیسے مل گئے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں وہ کس خیال میں ہے۔ کچھ ہی ہو۔ اُسے اپنے پتا کے گاہکوں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ابھی بچہ ہی ہے۔ اس کے دل میں عجیب و غریب خیال آتے ہیں۔ ان لوگوں کو چندو پر خفا نہیں ہونا چاہیئے بچہ ہی تو ہے۔ میرا خیال ہے تم اُس کے ساتھ کھیلنے کے لئے آئے ہو۔ اچھا تو جب وہ آئیگا میں اس سے کہہ دوں گی۔ وہ کہیں سڑک ہی کی طرف گیا ہو گا۔

میں نے کہا "بہت اچھا اماں"۔ اور گھر کو چلا آیا۔

اسی دن شام کو چندو میرے یہاں آیا اور معمول کے مطابق سیٹی بجائی۔ سیٹی ہی ہمارا ایک اشارہ تھا جس کو ہم سن سمجھ لیتے تھے اور بڑے بوڑھوں کی لعن طعن سے بچے رہتے تھے چونکہ انہیں ہمارا میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چندو نے دیکھتے ہی مجھ سے کہا۔ بازار کی طرف چلے آؤ۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اُس کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اُس نے کہنا شروع کیا: "تمہیں خبر ہے آج صبح میں نے کچہری کے قریب لوگوں کے سر مونڈ کر اور خط بنا کر ایک روپیہ کما لیا ہے! اگر مجھے چپیلے پھر جاری ہی لالہ جی کی گاڑی پر واپس نہ آنا ہوتا تو میں اور بھی بہت کچھ کما لیتا اب دیکھو تو میں ان رسم و رواج کے دیوانوں کو کس طرح سبق سکھاتا ہوں۔ میں ستیہ گرہ کرنے والا ہوں۔ میں اب ان کی خدمت گذاری کے لئے ان کے گھروں میں نہیں جاؤنگا

لالہ حکم چند جی کے بیٹے سے جو کبھی کبھی جوئے کا داؤ بھی لگاتا ہے۔ جاپانی بائیسکل پانچ روپے کو خرید کر چلانا سیکھ لوں گا۔ اور اس پر سوار ہو کر شہر جایا کروں گا۔ میں جب اپنی سفید پگڑی باندھ کر اور دوسرے کپڑے پہن کر بائیسکل پر سوار ہونگا —— اور خاص طور سے جب کہ اس دو پہیہ گاڑی کے سامنے بیگ لٹکانے کی ایک کھونٹی بھی ہے —— تو کہو دوست! بارعب معلوم ہوں گا کہ نہیں؟"

مجھے اس کی رائے سے اتفاق تھا۔ میں نے کہا: "ہاں!" میرے جسم میں جذبات کی پھریری سی آگئی۔ اس لیئے نہیں کہ سائیکل سوار چندو کی عظمت و شوکت کو خیال میں لا رہا تھا، بلکہ اس لیئے کہ اب میری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ مجھے خیال تھا کہ اگر چندو نے بائیسکل خرید لیا تو مجھے بھی کبھی کبھار چڑھنے کے لیئے دیدیا کریگا۔ اور اگر یوں نہ ہوا تو سائیکل کی پچھلی کھونٹی پر یا اس کے ساتھ آگے بیٹھ کر شہر تو چلا ہی جایا کروں گا۔"

چندو نے بائیسکل کا معاملہ کچھ اس خوبی سے طے کیا کہ مجھے اس قسم کا گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ روپیہ پیسہ وہ بے دریغ خرچ کر دیا کرتا تھا۔ لیکن اس معاملہ کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ واقعہ چندو کی تجارتی قابلیت کا اتنا بڑا اظہار ہے جس کا مجھے گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ اس نے رازداری کے طریقے سے مجھ سے کہا: "تم دو ایک روز اور انتظار کرو میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ تم اتنا ہنسو گے کہ کبھی عمر بھر میں اتنا نہیں ہنسے۔"

"مجھے ابھی بتا دو" میں نے بے صبری سے اُسے کہا۔ اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کے کارِ نمایاں کے جوہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اس نے کہا: "نہیں! ابھی انتظار کرو میں سردست نہیں صرف اشارۃً ہی بتا سکتا ہوں —— یہ ایک راز ہے۔ جو صرف ایک حجام ہی جان سکتا ہے۔ اب مجھے یہ مشین سیکھنے دو۔ تم اسے پکڑ لو میں اس پر بیٹھتا ہوں۔ خیال ہے کہ اسے چلا ہی لونگا۔"

میں نے کہا: "لیکن سائیکل سیکھنے کا تو یہ طریقہ نہیں۔ میرے پتا جی نے پچھلے پہیے کی کھونٹی سے چڑھنا سیکھا تھا اور بھائی نے پہلے کوشش کی تھی کہ پیڈل پر کھڑا ہو کر

اپنے بوجھ کا توازن قائم رکھے۔"

"تمہارے پتا جی تو ایک بھاری ستون ہیں۔ اور تمہارا بھائی لمبی ٹانگوں والا گیکڑ ہے"

میں نے کہا: "بہتر" اور اس کے سوار ہونے کے لئے بائیسکل تھام لیا میری نگاہیں ابھی بائیسیکل کے پالش کی چمک دمک کی داد دے رہی تھیں کہ ہینڈل میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور چندو سائیکل سمیت دھپ سے دوسری طرف جا گرا۔ ساہوکار کی دکان سے، جہاں کئی کسان زمیندار کے اردگرد اکٹھے ہوئے تھے، ایک ساتھ فضا میں قہقہے بلند ہوئے ساہوکار نے بھی چیخ کر کہا "کل جگ کے شیطان! خوب سزا پائی۔ چھوڑ دے کہیں کے ہڈی پسلی توڑ دو اور مرو۔ یوں تو تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔"

چندو کا سر ندامت سے جھک گیا اور لگا مجھے سخت سست کہنے میرا تو خیال تھا کہ اُسے یہ پریشانی میری وجہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے وہ مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے گرا دیگا لیکن اُس نے صرف اسی قدر کہا۔ احمق! تم بڑے ہی نکمے ہو پھر وہ میری طرف دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسا۔ اور کہا۔ دیکھ لیں گے! دنیا کس پر ہنستی ہے۔ مجھ پر یا ان پر۔

میں نے مستعدی سے کہا: "اب کے میں مضبوطی سے پکڑ دوں گا" پھر میں نے گرے ہوئے سائیکل کو اُٹھا لیا۔

زمیندار نے کہا: "ہاں! توڑ دو ہڈی پسلی بیوقوف کہیں گے!"

چندو نے مجھ سے کہا: "پروا نہ کرو میں اُنہیں بتا دوں گا" میں نے پورے زور سے سائیکل کو پکڑ لیا۔ اور وہ ہمت کر کے گدی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے کہا: "چھوڑ دو"

میں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اس نے دائیں پاؤں کے زور سے پیڈل کو دبایا۔ پہیے گھومے ہی تھے کہ چندو کا بوجھ ایک طرف کو جا پڑا۔ گرا ہی چاہتا تھا کہ اس کا پاؤں دوسرے پیڈل پر آگیا۔ توازن کچھ قائم ہو گیا لیکن جھکاؤ اب کچھ دائیں طرف کو تھا۔ چندو کچھ اس طور سے گدی پر سے ہلا کہ خوف و ہراس سے دل کانپ اٹھا۔ لمحے بھر کے لئے وہ ایک

طرف کو خطرناک طور سے لٹک بھی گیا۔ اس کا ہینڈل ڈگمگا گیا۔ اور وہ لڑکھڑانے لگا۔
اس موقع پر ہنسی اور طنز کی ملی جلی ہوئی آوازیں دکان سے آتی ہوئی سنائی دیں میرا خیال
تھا کہ اگر وہ اب کے اپنے اناڑی پن کی وجہ سے ذلیل نہ بھی ہوا تو یہ شور و غل اسے ضرور
لے بیٹھے گا لیکن کچھ معجزہ ہی ہوا۔ چندو کے پاؤں ٹھیک ٹھیک پیڈلوں پر چلنے لگے۔
ہینڈل کو بھی اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور اس کو بھی کوئی جنبش نہ ہوئی اور آگے
ہی آگے بڑھتا گیا میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرا گلا "شاباش شاباش" کی پرجوش
آواز سے پھٹا جاتا تھا۔

ایک میل تک وہ اسی طرح چلا گیا۔ اور واپسی پر بھی اس نے ایسا ہی کیا۔
یہ چندو کا ایک نیا کمال تھا۔ اسے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ میں بھی اس کی خوشی
میں شریک ہونے کا مشتاق تھا لیکن میں دوسرے دن اس سے نہ مل سکا۔ چونکہ مجھے سیدھے
اسکول سے ہی اپنی چچی سے ملنے کے لئے دیہہ کو جانا پڑا تھا۔

تیسرے دن وہ میرے ہاں آیا اور اس نے کہا "کل جس مذاق کا میں نے تم سے
ذکر کیا تھا۔ ابھی ابھی تم پر ظاہر ہو جائیگا۔ میں فوراً ہی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس سے
پوچھتا جاتا تھا" بتاؤ وہ ہے کیا؟"

وہ خود گاؤں کے کمہار کے تنور میں چھپ گیا اور کہنے لگا دیکھو! ساہوکار کی دکان
میں جمگھٹا لگا ہوا ہے۔ اسے تم دیکھتے ہو؟ پہچانو تو کون کون ہے؟

میں نے مختلف صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لمحے بھر کے لئے دماغ کو چکر
سا آگیا میں نے کہا "مجھے تو صرف کسان نظر آتے ہیں۔ جو زمیندار کا انتظار کر رہے ہیں"۔
اس نے کہا پھر دیکھو! تم تو احمق ہو۔ زمیندار وہیں ہے۔ وہ دیکھو لمبے لمبے جبڑوں
والا۔ اس کے منہ پر سفید سفید جھاگ لگا ہوا ہے۔ یہ جھاگ نہیں سفید بال ہیں جو حجامت
نہ ہونے کی وجہ سے بڑھ آئے ہیں۔ زمیندار اپنی گھنی مونچھوں پر مہندی لگایا کرتا تھا میں
دن جوں زنگدار مونچھوں اور گردن کے سفید جھاڑی دار بالوں کو دیکھتا تھا۔ حیرانی سی

ہوتی تھی۔ دفعتہً میرے منہ سے نکل گیا۔ "ہاہاہا" بیمار شیر کتنا زیادہ بیمار نظر آتا ہے۔"

چندو نے تنبیہ کے طور سے کہا۔ چپ رہو۔ شور نہ کرو۔ ساہوکار کو تو دیکھو۔ کوڑھی نظر آتا ہے۔ اس کی مونچھیں دیکھو۔ تمباکو کے دھوئیں سے زرد ہو رہی ہیں۔ انہیں کبھی میں تراشا کرتا تھا۔ اب تم دکان کے پاس جاؤ۔ اور وہاں پہنچکر کہو۔ "اودبلاؤ۔ اودبلاؤ۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

میں شریر چندو کا ایک پُرجوش چیلا تھا۔ ذرا بھی تو دیر نہ کی۔ میں نے دکان کے ارد گرد کھڑے تھے۔ ان کے دل گدگدا رہے تھے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن پاس ادب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔

ساہوکار نے چلّا کر کہا۔ پکڑ لو اس چھوٹے شیطان کو۔ یہ اُس حجام لڑکے چندو کا ساتھی ہے۔

لیکن میں اتنے میں بڑ کے درخت پر چڑھ چکا تھا اور وہاں سے مندر کی دیوار پر کود گیا تھا۔ وہاں میں نے پجاری پر بھی فقرے کسے۔

اس حجام لڑکے کی ستیہ گرہ کی افواہ سارے گاؤں میں پھیل گئی اور گھر گھر بڑے بوڑھوں کی بڑھی ہوئی داڑھیوں کا مذاق اڑنے لگا۔ اونچی ذات کے لوگ یہاں تک کہ خود ان بزرگوں کے گھر کے افراد بھی اس اجنبیت پر ہنس ہنس پڑتے تھے۔ اور ان کی شکل وصورت پر عجیب وغریب خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ جب تک داڑھی مونچھ کٹتی رہی زمیندار کی جوان بیوی خاموش رہی۔ لیکن اب تو اسے کراہت سی ہو گئی تھی۔ اس کراہت کے دور ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اب اس نے کبھی جوان مرد کے ساتھ ہم سفر ہونے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر وہ اپنے میاں سے بیس برس چھوٹی بھی تو تھی۔

چندو ان دنوں بدستور شہر جاتا رہا اور وہاں خوب خوب ہاتھ رنگے۔ ان دنوں چندو کا کام کاج شہر میں خوب چلا اور اُس نے کافی رقم بچالی۔ اپنے لئے نئے کپڑے اور نئے اوزار بھی خرید لیئے اور مجھے بھی کئی تحفے لاکر دیئے۔

گاؤں والے یہ دھمکی دیتے تھے۔ کہ اُسے بدعنوانیوں کی وجہ سے جیل بھجوا دیں گے اُس کی ماں کو بھی حکم ملا تھا کہ وہ اسے ٹھیک راستے پر چلائے ورنہ نقضِ امن کی پاداش میں اُسے پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔

لیکن چندو کی ماں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ خوش حالی کا منہ دیکھا تھا۔ وہ اُن کے متعلق جو کچھ خیال رکھتی تھی۔ صاف صاف اُن کے منہ پر کہدیا۔ اور اتنا صاف کہ اُس سے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔ گاؤں والوں نے سوچا کہ یوں کام نہ چلے گا۔ ویرکے کے حجام کو بلا لو۔

چندو کو وہ عام طور سے حجامت کے دو پیسے دیا کرتے تھے۔ ویرکا کے حجام کو دو پیسے کے بجائے ایک آنہ پیش کرنا منظور کیا۔

چندو کے ذہن میں نئے نئے تصورات تھے۔ اتنے نئے کہ پہلے اُسے کبھی سجھائی نہ دیتے تھے۔ شہر کے حجام نرنجن داس کی دکان کو دیکھ کر اُسے بھی تجویز سوجھی کہ شروع بازار میں عین شاہراہ پر اپنے چچیرے بھائی، ڈھونڈو اور حجاموں کو ساتھ ملا کر دکان کھول لے۔ اس کا چچیرا بھائی وہی "ویرکے" کا حجام تھا۔ اور یہ لوگ گاؤں کے اردگرد کام کیا کرتے تھے۔ ان کے کام کاج کا دائرہ سات میل تک تھا۔ اس نے اپنی تجویز اپنے چچیرے بھائی، ڈھونڈو اور دوسرے حجاموں کو ذات برادری کا عام جلسہ کر کے بتائی دل اور دماغ کی خوبیوں کے ساتھ قدرت نے اُسے فصاحت کا مادہ بھی ودیعت کیا تھا۔ اس نے اپنی لسانی سے حاضرین کو یقین دلا دیا۔ کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ امیر و کبیر حجامت بنوانے کے لئے ہمارے ہاں خود چل کر آئیں۔ نہ یہ کہ ہم اپنا ساز و سامان لئے لئے اِن کے گھروں کا طواف کریں۔

"چندو برادرس ہیر کٹنگ اینڈ شیونگ سیلون" نے حقیقت میں دنیا کے لئے ایک راستہ تیار کر دیا۔ اور آج تک ہمارے ملک کے مزدوروں کی کئی سرگرم انجمنیں اسی سیلون کا اتباع کرتی ہیں۔

کرشن چندر

دردِ گردہ

کرسچین کراہ رہا تھا۔ دردِ گردہ نے اس کے پیٹ اور اس کے دھڑ میں کرب انگیز لہریں
دوڑا دی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ان لہروں سے مدافعت نہ کر
سکے گا۔ اور پھر کل اس کا اپریشن ہونے والا تھا۔ دوسرا اپریشن۔ پہلا اپریشن کامیاب نہ ہوا
تھا۔ دائیں گردے کا بہت سا حصہ کاٹ ڈالا گیا تھا۔ اور وہ پتھری بھی نکل آئی تھی۔ لیکن
درد اسی شدت کے ساتھ موجود تھا۔ اور پیشاب زخم سے رستا تھا۔ لحظہ بہ لحظہ گویا اس کی
جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے سرہانے کے دائیں طرف لوہے کی سلاخ پکڑ کر اسے زور
سے کھینچتا لیکن اس سے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوتا تھا۔ الٹا اسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہسپتال
کے آہنی بستر کی سلاخیں اس کے پیٹ میں چبھی جا رہی ہیں "میرے خدا ..... میری
ماں" وہ بار بار کہتا۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ یعنی خدا کے پاس جا چکی تھی۔ اور خدا .....
اے خدا میری سن لے میں اس درد کی شدت میں مرا جاتا ہوں کل میرا اپریشن ہونے والا

ہے۔ دوسرا اپریشن اسے خدا مجھے زندہ رہنے دے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ میرے جینے کیلئے ایک ہی گردہ کافی ہے۔ اے خدا مجھے اس درد سے نجات دے۔ مجھے زندہ رکھ اے خدا۔ ۔ ۔ ۔ میری ماں " وہ آہستہ آہستہ دیر تک کراہتا رہا اور اپنے خدا اور اپنی ماں اور اس ہولناک سیاہ رنگ کی پتھری کو یاد کرتا رہا۔ جو پہلے اپریشن کے وقت اس کے گردے میں سے نکالی گئی تھی۔ اس کے ابروؤں کے نیچے دو سیاہ گڑھوں میں اس کی آنکھیں خطرناک طور پر چمکتی تھیں لیکن اس کے چہرے پر زردی کی کوئی علامت نہ تھی کیونکہ اس کے چہرے کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ اور یہ سیاہی اور بھی گاڑھی ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی فاؤنٹین پین کی سیاہی کی طرح تھی۔ جو لکھتے وقت تو تازہ اور بلیو بلیک رنگ کی ہوتی ہے لیکن خشک ہوتے ہوتے بالکل سیاہ ہو جاتی ہے۔

جانے اپنی سفید ٹوپی کو ٹھیک کرتی ہوئی اس کے بستر کے قریب آئی۔ جانے کی شفقت اور ہمدردی اور ممتا سارے ہسپتال میں مشہور تھی۔ باقی نرسیں بھی بیماروں سے نہایت ملاطفت سے پیش آتی تھیں لیکن کنواری جانے کا انداز ہی الگ تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں کی حزیں موہنی۔ اس کے لبوں کی پتلی خمیدہ مسکراہٹ۔ جیسے پہلے دن کے چاند کا سیمیں کنارہ۔ اس میں ایسی پاکیزگی تھی۔ جو مرتے ہوئے بیماروں کے دلوں پر بھی تسکین کا پھاہا رکھتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ مسکراہٹ سب کچھ سمجھتی ہے سب کچھ جانتی ہے۔ جیسے وہ ساری کائنات کے دکھ اور درد کا بار اپنے نازک قوس پر اٹھائے ہوئے ہے۔ کرسچین اسے دیکھتے ہی اپنے درد میں کمی محسوس کرتا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا۔ گویا وہ کرب انگیز طوفانی لہریں جو اس کے پیٹ اور دھڑ میں تڑپ رہی ہیں۔ اب مدھم اور ہلکی ہوتی جا رہی ہیں۔ اور جب تک وہ اس سے ہمکلام رہتی۔ یا اس کی چھاتی پر ہاتھ پھیرتی رہتی۔ اس کا درد مدھم رہتا۔ اور اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں غنودگی پیدا ہونے لگتی ہے اور اس کے سانس کی روانی ٹھیک ہونے لگتی۔ کرسچین اس وقت ایسا محسوس کرتا۔ گویا جانے کی آنکھوں میں مریم کا سا تقدس ہے۔ اور اس کے ہاتھوں میں پاپ پیوس

کی مسیحائی۔ اکثر کرسچین کو ایسا محسوس ہوتا۔ کہ جانے اُس کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں دوسرے بیماروں کی نسبت زیادہ شفقت اور تندہی سے کام لیتی ہے۔ اس لئے بھی وہ جانے کو اپنے قریب پاکر زیادہ آرام محسوس کرتا تھا۔

کرسچین کا درد آج خلافِ معمول بہت بڑھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جانے بھی خلافِ معمول آج زیادہ غمگین معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ گہری تھی۔ آنکھیں ڈبڈبائی سی۔ وہ ایک کرسی کھینچکر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی "معلوم ہوتا ہے خواب آور دوائی کی خوراک نے تم پر کچھ اثر نہیں کیا۔"

"نہیں آج بہت درد ہے" اس نے رُکتے ہوئے جواب دیا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہیں ایک خوراک پلائے دیتی ہوں۔ تم بہت آرام سے سو سکو گے۔ کل تمہارا اپریشن ہونے والا ہے۔ اور اُس کے بعد تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔"

"ہاں۔ اس کے بعد میں بالکل اچھا ہو جاؤں گا" کرسچین نے نا اُمیدی کے لہجے میں کہا نرس نے کرسچین کو خواب آور دوا کی دوسری خوراک پلائی۔ اور کرسچین کی آنکھوں سے اُبلتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ دیا۔ کرسچین نے اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میرا دم گھٹا جاتا ہے" لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جانے نے اسکی چھاتی کو اپنے ہاتھوں سے سہلانا شروع کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ کرسچین کی آنکھوں میں غنودگی آنے لگی۔ وہ سوچنے لگا۔ جانے کتنی اچھی ہے۔ خدا کتنا مہربان ہے۔ اسے اپنی ماں کی یاد آئی جو اب مر چکی تھی۔ اچھا ہوا۔ ورنہ وہ اپنے بیٹے کو یوں موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہ دیکھ سکتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسے جانے نے اُنہیں نہیں پونچھا۔ ہاں وہ اس دنیا میں اب بالکل اکیلا تھا۔ ایک غریب کلرک۔ بے یار و مددگار۔ خیراتی ہسپتال میں دم توڑ رہا تھا۔ شروع شروع میں اس کے دفتر کے چند دوست اُسے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ ایک دفعہ اُس کے سیکشن کا بڑا بابو بھی اُسے دیکھنے آیا تھا اور اُس کے لئے پھول اور پھل بھی لایا تھا۔ لیکن اب مدت ہوگئی

کسی نے اُس کی خبر نہ لی تھی۔ چند ایک رشتے دار تھے۔ لیکن وہ جبل پور میں تھے۔ اتنی دور کرایہ خرچ کرکے وہ کیسے آتے۔ اور اگر آ بھی جاتے تو کیا کرتے۔ اُس کی چھٹی کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ پوری تنخواہ اور آدھی تنخواہ والی دونوں قسم کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اب وہ بلا تنخواہ چھٹی پر تھا۔ دفتر کا کام بدستور چل رہا تھا۔ اور اُسے یہ جان کر بہت رنج ہوا تھا۔ وہ اپنا وجود دنیا میں بہت ضروری سمجھتا تھا۔ جیسے دنیا کا کام کرسچین کے بغیر نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اب جس دن سے وہ بلا تنخواہ چھٹی پر تھا اُسے اپنے غیر مصرف ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ جانے کتنی مہربان ہے اور وہ نیا آدمی جو اُس کی جگہ کام کر رہا تھا۔ یہی سوچتا ہو گا کہ خدا کرے۔ وہ مر جائے۔ اور وہ اُس کی جگہ ملازمت سنبھال لے۔ آخر اُسے اپنے پیٹ کا دھندا کرنا تھا۔ لیکن یہ اُسے کیا معلوم۔ کہ کبھی پیٹ کا دھندا کرتے کرتے ایسی کرب انگیز لہریں اُٹھتی ہیں کہ۔ ۔ ۔ ۔ ہرا باغ خوبصورت پھول پیلا فراک پہنے ہوئے سائیکل سوار حسین لڑکی۔ نیلے آسمان میں سفید کبوتروں کی ڈار۔ اور پھر دفتر کا میز جس پر جا بجا سیاہی کے بدنما دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے سوچا کہ پیٹ میں ایسی کرب انگیز لہروں کے اُٹھتے ہوئے بھی اُس کا ذہن ان چیزوں کی طرف کیوں منتقل ہوتا ہے۔ تیس روپیہ ماہانہ میں اسے کیا خوشی نصیب تھی۔ صبح سے لے کر شام تک وہ میز پر سر جھکائے فائلوں میں اندراج کرتا رہتا۔ اور افسروں کی جھاڑ سن کر اور بھی زیادہ انہماک سے میز کے اوپر جھک کر کام کرنے لگتا۔ ہائے یہ درد۔ جیسے اُس کی جان کو اندر ہی اندر سلب کئے جاتا ہے۔ پیلا فراک پہنے ہوئے سائیکل سوار شوخ لڑکی دفتر آتے جاتے اُسے اکثر ملتی تھی۔ لٹن کیسل کے قریب۔ یوکلپٹس کے درختوں کی اونچی پھننگیں نیلے آسمان کے پس منظر میں لہراتی تھیں۔ سفید کبوتروں کی ڈار اُڑتی چلی جا رہی تھی۔ کاش اُس کے پاس کیمرہ ہوتا۔ ایک بار اُس نے اپنی تنخواہ میں سے تین روپے بھی بچائے تھے لیکن پھر سردیوں میں اُسے کھانسی کی دوا خریدنا پڑی تھی۔ لال لال دوا۔ بعض دوائیں بہت خوشرنگ ہوتی ہیں۔ بعض اُس کے چہرے کی طرح سیاہ۔ لیکن اُس کے نقش تو اتنے برے نہ تھے۔ مدت سے اُس نے آئینہ بھی نہ

دیکھا تھا۔ اور اُس کی نگاہوں میں پھر پیلا فراک گھومنے لگا۔ کتنا اچھا فراک تھا وہ حسین
لڑکی مِس جانے بس کنواریوں میں حسین ہے۔ اور شفیق۔ مہربان . . . . ہائے یہ درد
جیسے تند لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہر ایک تھپیڑے سے اُس کا جسم لرزنے لگتا تھا
دُکھنے لگتا تھا۔ کل اُس کا اپریشن تھا مِس جانے اُس کی چھاتی سہلا رہی تھی سب مریض سو
رہے تھے۔ کیا معلوم یہ اُس کی آخری رات تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو اُبلنے لگے
لیکن وہ تو ابھی نوجوان تھا۔ اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اُس کے پاس کچھ بھی
نہ تھا۔ لیکن پھر بھی بے مصرف ہو کر بھی وہ اِس دُنیا میں رہنا چاہتا تھا۔ دنیا کو میری موت
کی پروا نہیں لیکن مجھے اپنی زندگی کیوں پیاری ہے مِس جانے اب تو تھک گئی ہوگی
یہ ننھی پتلی انگلیاں۔ بیچاری مِس جانے "صبح سے لے کر شام تک کام کرتی ہے کبھی اس
کے ماتھے پر بل نہیں پڑتا۔ اس نازک ناتواں جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آئی۔ اتنی جان
اتنی روشنی۔ اتنی آگ۔ کرسچین کے پاس اس کی ماں کی دی ہوئی انجیل تھی۔ اُس کی
متاعِ تمام۔ اس کی ماں کی آخری نشانی۔ وہ اسے قبر میں نہ لے جائیگا جب مِس جانے
اُس کی چھاتی سہلا کر اُٹھے گی۔ تو وہ اِسے اُس کے حوالے کر دیگا۔ اُس کی نگاہ کہے دیتی
ہے کہ وہ دلوں کا درد پہچانتی ہے۔ وہ اُسے لینے سے انکار نہ کرے گی۔ کل اپریشن ہے
کیا مرنے سے پہلے یہ ہسپتال والے مجھے لڈو کیسل نہیں دکھا سکتے۔ وہ سڑک کا موڑ پیلے
فراک والی لڑکی۔ سفید کبوتر۔ یوکلپٹس کی شاخیں ہوا میں جھومتی ہوئیں تھرتھراتی ہوئیں
لہروں کے گول گول چکر . . . جانے کے ہاتھ گھومتے ہوئے . . . . لیمپ کی روشنی
مدھم ہو چلی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ روشنی اور تاریکی . . جھلمل . . جھلمل . . . .
کرسچین سو رہا تھا اور لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ جانے آہستہ آہستہ اُس کی چھاتی
سہلائے گئی۔ لیمپ کی روشنی میں کرسچین کا چہرہ ایک سیاہ نقاب کی طرح دکھائی دے رہا
تھا۔ جیسے کارنیوال کے دنوں میں لوگ ماسک اکثر پہنتے ہیں۔ کارنیوال . . . کارنیوال . . . .
کارنیوال دیکھے ہوئے کتنی ہی مدت ہوگئی۔ اُسے مریضوں کی تیمارداری سے اتنی

فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ کارنیوال اور کارنیوال کی خوشیاں! اور سہیلیوں کے معصوم قہقہے جن میں جوانی کی خوشیاں چھلکتی تھیں۔ کرسچین کی آنکھیں بند تھیں اور دو سیاہ گڑھوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں پپوٹوں کی جھلیاں آپس میں اس طرح جڑی ہوئی تھیں جیسے کسی خشک لیکن تاریک گڑھے کی تہ پر گندگی کی سیل جمی ہوئی ہو۔ آج سے تین سال پہلے اسی طرح۔ اسی بستر پر پڑے پڑے اس کے محبوب نے درد و کرب سے جان دی تھی۔ اس کا آپریشن بھی دوبارہ کیا گیا تھا۔ ان دنوں وہ بھی نئی نئی ہسپتال میں آئی تھی۔ اور ہندوستانیوں کے بھورے۔ کالے زنگدار جسموں کو ہاتھ لگانے سے بھی ہچکچاتی تھی۔ ایک خاص قسم کی نفرت تھی۔ جس پر وہ قابو پانے کی بہت کوشش کرتی تھی پھر بھی وہ نفرت بدستور قائم تھی۔ لیکن جاوید نے اس کی نفرت کو محبت میں تبدیل کر دیا تھا لانبا قد۔ کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ جن میں ہر وقت ایک ذہنی پریشانی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ فراخ ماتھا۔ بال پتلے ملائم اُلجھے ہوئے۔ اُسے اُس کے بال اب بھی یاد آ رہے تھے جب وہ اُس کے سر میں تیل ڈال کر آہستہ آہستہ مالش کر کے انہیں پیچھے کی طرف گھما دیا کرتی تھی چنبیلی کے تیل کی تیز سی خوشبو اُس کے نتھنوں میں پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور اب بھی گویا وہ اپنی ناتوان سی انگلیوں کو بالوں کے نرم و نازک گچھوں سے چھو رہی تھی...
آہ۔ لیکن یہ تو کرسچین کی چھاتی کے بال تھے سخت اور کھُردرے۔ غریب کرسچین۔ کل اس کا آپریشن ہوگا۔ اور پھر خدا جانے . . . . . . اس سے کرسچین کا دُکھ نہ دیکھا جاتا تھا اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنے محبوب کو دوبارہ مرتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ اُس کی نیلی آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔ کسی زمانے میں اسے ہندوستانیوں سے نفرت تھی۔ لیکن جاوید نے اس کی نفرت کو محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔

وہ اکثر اکیلا پڑا کراہتا رہتا۔ یا پھر کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔ لیکن اُسے مذہبی کتابوں سے نفرت تھی۔ اُسے یاد آیا کہ کس طرح اُس نے جب ایک بار اُسے انجیل پڑھنے کو دی تھی۔ تو اُس نے اُسی وقت اس کتاب کو چوم کر اسے واپس کر دیا تھا "میں مذہبی کتابیں نہیں پڑھا کرتا۔ لیکن میں نے اُسے تمہاری خاطر چوم لیا ہے" وہ اسی طرح عجیب عجیب

باتیں کیا کرتا۔ اور کبھی ایک دم چپ ہو جاتا۔ اور گھنٹوں کسی سے کلام نہ کرتا۔ اسکے دوست بہت تھے۔ اور اکثر اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ انہیں اکثر اس کے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدیتی تھی۔ گو یہ قاعدے کے خلاف تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ وہ کچھ اس لہجے میں جس میں خودداری اور لجاجت دونوں ملے ہوتے ہوتے۔ اس سے اجازت طلب کرتا کہ وہ اس کی بات رد نہ کر سکتی تھی۔ جاوید شدید درد کے وقت بھی بہت کم چلاّتا تھا۔ شاید اس بات نے اُسے پہلے پہل متاثر کیا تھا۔ وہ پہلی نگاہ اُسے کبھی نہیں بھولتی تھی۔ وہ کسی کام کی وجہ سے بھاگتی بھاگتی اس کے بستر کے قریب سے جا رہی تھی۔ کہ یکایک اُس کی نگاہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اس کے لب بھینچے ہوئے تھے۔ زرد یا سپید سے لب۔ لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وہ تمام خوفناک کرب نمایاں تھا۔ جو اس کے بیمار گردے سے نکل کر اس کے سارے جسم میں لہریں پھیلا رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے وہ کوئی تنہا جا تو رہے اور پانی کے اندر سمندری ہزار پایہ سے اکیلا جنگ کر رہا تھا۔ ہزار پایہ کے بلتے ہوئے بازو اس کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے لیکن وہ نہایت جیداری سے جنگ کرتا تھا استقلال اور ہمت اور خاموشی۔ جیسے اُس کی پشت دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اور سامنے بندوقوں کی باڑ کے مقابلے پر وہ قہقہے لگا رہا ہو۔ اور جب اُس نے پوچھا: "تمہیں کیا تکلیف ہے؟" تو اُس نے نہایت نرمی سے کہا: "درد گردہ" اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ جنگ اُس کی ذاتی جنگ تھی۔ وہ اُسے جانے کی ترحمانہ نگاہوں سے بچانا چاہتا تھا۔ جانے نے اکثر دیکھا تھا۔ کہ ہندوستانی جب بیمار ہوتے ہیں۔ تو بہت چلاّتے ہیں۔ دُکھ تھوڑا ہوتا ہے۔ شور زیادہ ہوتا ہے۔ ہر وقت "مس صاحب!" "مس صاحب!" کی رٹ لگی رہتی ہے۔ جیسے مس صاحب کو دن بھر میں صرف ایک ہی بیمار کو دیکھنا ہوتا ہے اور انہیں اسی کے علاج معالجے۔ تیمارداری اور دیکھ بھال کے لئے تنخواہ ملتی ہے۔ بیمار لوگ چڑچڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ لیکن ہندوستانی تو بالکل صبر کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔ سب تو نہیں لیکن اکثر۔ . . . جاوید اُس نے پہلا ہندوستانی مریض

دیکھا تھا۔ کہ درد سے بیتاب ہو کر بھی اُف نہ کرتا تھا۔ اکثر خواب آور دوا بھی نہ پیتا تھا۔ کئی بار جب وہ دوا لیکر اُس کے سرہانے کھڑی ہوئی۔ تو اُس نے کتاب پڑھتے پڑھتے اُس کی طرف ایک حزین مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں یہ خواب آور دوا نہ پیوں۔ مجھے درد سے جنگ کرنے میں مزا آتا ہے۔ درد میری توجہ اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ میں اپنی توجہ کتاب کو پڑھنے میں صرف کرتا ہوں اور اکثر" وہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتا "اکثر میں کامیاب ہو جاتا ہوں" لیکن کرسچین بیچارا تو اکثر بالکل کسی دو سالہ بچے کی طرح بلبلا اُٹھتا ہے کس قدر کمزور ہو گیا ہے سوکھی ہوئی گردن میں حلقوم کسی اکھڑے ہوئے درخت کی مڑی ہوئی جڑ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ کل کے اپریشن سے جانبر ہو سکے گا۔ لیکن ڈاکٹر واٹ ———— ڈاکٹر واٹ کو ذہن میں وہ اپنے سامنے آتے دیکھ کر کانپ اُٹھی۔ میانہ قد۔ سرخ مونچھیں گٹھا ہوا جسم بڑے بڑے مضبوط ہاتھ۔ شکل وصورت اور اطوار سے بھی وہ ایک سرجن کے بجائے ایک قصاب نظر آتا تھا۔ جب وہ ہسپتال میں نئی نئی آئی تھی تو ڈاکٹر واٹ نے اُسے کہا تھا۔ کہ جاسے سب کنواریوں میں سب سے زیادہ حسین ہے اور اس نے شرارت سے اس کے گال پر ایک چٹکی بھی لی تھی۔ اس کا سارا جسم آگ کی طرح گرم ہو گیا تھا۔ اور اُس کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ کر ڈاکٹر واٹ نے کھسیانی ہنسی ہنسکر اس سے کہا تھا۔ یہ تو ایک مذاق ہے۔ ننھی لڑکی جاؤ وارڈ میں کام کرو۔ وارڈ میں اسے پہلے پہل ہندوستانیوں کے جسموں سے بھی ایک قسم کی بو آیا کرتی تھی۔ جسے فنائل اور لائی سول بھی نہیں دور کر سکتے تھے۔ جاوید کو فنائل کی بو سے سخت نفرت تھی۔ اور جب اُسے نفرت کا احساس ہوا تھا تو اُس نے مہتر کو ہدایت کر دی تھی۔ کہ کم از کم اس کے بستر کے ارد گرد وہ فنائل یا لائی سول نہ چھڑکا کرے وہ خود ہر روز اس کے بستر کے ارد گرد پوٹاشیم پرمنگنیٹ کا سرخ پانی چھڑکا کرتی تھی۔ اور وہ مسکرا کر کسی اردو شاعر کا ایک شعر پڑھا کرتا تھا۔ ہندوستانی کو وہ ایک غیر مہذب زبان سمجھتی تھی۔ لیکن وہ شعر سُن کر اُس کے گالوں پر بھی سرخی دوڑ جاتی تھی۔ جاوید نہایت

چھوٹی چھوٹی باتوں سے اُسے خوش کر دیا کرتا تھا۔ آج یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بھالے بنکے
اُس کے کلیجے میں چبھ رہی تھیں۔ . . . کیوں نہ وہ بھی دردگردہ سے مرگئی . . . . . .
اُسے یاد آیا۔ کہ جب جاوید کا پہلا اپریشن ہؤا تھا۔ تو وہ کتنا بشاش نظر آتا تھا۔ جیسے معلوم
تھا۔ کہ وہ یوں اپنی حزیں مسکراہٹ کو چھپا کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلا جائیگا۔ اُسے
موت ہسپتال ہی میں کیوں آئی؟ کیا وہ کسی اور جگہ جا کر نہ مر سکتا تھا۔ وہ یہاں داخل ہی
کیوں ہؤا۔ اور اگر داخل بھی ہؤا تھا تو کیوں اس نے اپنی مرتی ہوئی زندگی کا اثاثیت
اُس کی آنکھوں میں جھونک دیا تھا۔ جانئے کو اپنی آنکھیں جلتی ہوئی معلوم ہوئیں اور آنسو
تیز رفتاری سے اُس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ یہ کیا انصاف تھا۔ یہ کیسی خدائی تھی۔ وہ
یہاں اپنے روزگار کا دھندا کرنے آئی تھی۔ نہ کہ رُوح کو روگ لگانے کے لئے۔

جانئے نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اپنے غم کو بھول جائے گی۔ زیادہ تندہی [illegible]
بیماروں کی خدمت کرے گی۔ اس خدمت کو ایک مقدس فرض سمجھ کر سرانجام دے گی۔
اُسے اِس فرض سے عشق ہونا چاہیئے لیکن عشق تو اُسے جاوید کی آنکھوں سے تھا۔ اس
کی علو ہمتی سے۔ اس کے صبر سے۔ اس کی حزیں مسکراہٹ سے۔ وہ اب ان [illegible]
کہاں سے لائے۔ اب جاوید کی یاد میں ان کی چند کتابیں رہ گئی تھیں۔ اردو کی کتابیں [illegible]
وہ سمجھ بھی نہ سکتی تھی۔ لیکن جنہیں اُس نے نہایت احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہؤا تھا۔
انگریزی کی بھی چند کتابیں تھیں۔ جن پر لال پنسل سے نشان تھے۔ اور کہیں کہیں [illegible]
کیٹس کے ایک مصرعے کے آخری تین حرف
[illegible]

اور پھر

. . . . . غریب جاوید۔ . . . . . وہ جانئے کو عارضی سمجھتا تھا۔ [illegible]
تھا۔ کہ کمبخت جانئے اُس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گی۔ ایک بار اُس نے [illegible]
ہو۔ جانئے اور جاوید دونوں نام ایک ہی حرف سے شروع ہوتے ہیں۔ [illegible]
—— وہ یہ سُن کر دل ہی دل میں کتنی خوش ہوئی تھی۔ اور [illegible]

بار لکھا تھا۔ جائے۔ جاوید ــــــ "جائے جاوید" ــــــ پہلے اپریشن کی رات کو وہ یکایک
مغموم ہو گیا تھا۔ یاسیت اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ دن بھر دوست اُسے بہلاتے
رہے تھے لیکن وہ ہر بار کسی غیر معلوم یقین کے ساتھ کہہ اُٹھتا۔ نہیں دوست میں اِس
اپریشن سے جانبر نہیں ہو سکتا۔ اور جب دوست چلے گئے تو اس کا تخیل اور بھی تاریک
ہوتا گیا۔ وہ ایسی نظروں سے جائے کو تک رہا تھا۔ جیسے وہ اُسے ہمیشہ کے لئے الوداع
کہہ رہا ہو۔ پھر جائے نے بارہ بجے کی راؤنڈ کے وقت بھی اُسے جاگتے ہوئے پایا تھا۔
اور جائے نے اُسے آہستہ سے کہا تھا۔ میں نے ابھی باہر ایک میڈیکل سٹوڈنٹ سے تمہارے
نام کا مطلب پوچھا تھا۔ اس نے کہا۔ جاوید کے معنے ہیں "ہمیشہ رہنے والا" تم جو ہمیشہ
رہنے والے ہو۔ کیسے مر سکتے ہو۔ اس پر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ شاید اُسے جائے
کی بات کا یقین ہو گیا تھا۔ اور دوسرے دن اُس نے ہنسی خوشی اپریشن کرا لیا تھا۔ پھر
جائے کو یاد آیا۔ جب اس نے متواتر تین دن تک جاوید کے جسم پر مالش نہیں کی تھی۔
پورے تین دن تک۔ اسے معلوم تھا۔ کہ جاوید اس کے ہاتھ سے مالش کرانا کتنا پسند
کرتا ہے۔ لیکن دو دن سے وہ اس کے بستر کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی۔ اور مسکرا کر اُس
کے قریب سے ہو کر اِدھر اُدھر گذر جاتی تھی۔ جاوید نہایت ہی خاموشی سے اُسے برداشت
کرتا رہا۔ اور ہارڈی کا ایک ناول پڑھتا رہا۔ اُس نے اُس کی طرف توجہ ہی نہ دی لیکن
تیسرے دن جب وہ اسے مالش کرنے بیٹھی تو اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ دو
دن سے تم نے مجھے مالش نہیں کی جائے۔ اور جائے ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں
کی ملول تنہائیوں میں کھوئی گئی۔ اور پھر جب جائے نے کہا "مجھے دو دن زکام رہا میں
نے کہا تمہیں مالش نہ کروں کہیں تمہیں بھی زکام نہ ہو جائے" تو ان کی آنکھوں کی تاباں
مسرت اور محبت نے جائے کے دل کے گوشے گوشے کو لبریز کر دیا تھا۔ ہائے وہ خوبصورت
لمحے۔ اس وقت جاوید کے بستر پر بیٹھے ہوئے جائے کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ
ساتت سمندروں کی رانی ہے اور زخمی شاہ آرتھر کو اپنی شاہی کشتی میں بٹھائے کسی اپنے نامعلوم

ہسپتال میں گھسنے بھی نہ دیا جائیگا۔ اور کل جاوید کا اپریشن تھا۔ یکایک جاوید کا اپریشن
تھا۔ یکایک جانے نے اپنے دل سے ایک فیصلہ کیا۔

جانے کو آج بھی۔ جبکہ اس واقعہ کو تین سال ہوچکے تھے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اسکا فیصلہ
صحیح تھا یا غلط۔ بہرحال اس فیصلہ کے بعد خدا نے اُس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ اس
کی تبدیلی منسوخ ہوگئی تھی۔ اور اب جانے کو جو ہسپتال کی کنواریوں میں سب سے زیادہ حسین
تھی۔ صرف اتنا یاد تھا۔ کہ دوسرے دن جب وہ اپنے لب بھینچے گارڈینا کے پھولوں کا گچھا
اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر وارڈ میں گئی۔ تو اُس نے دیکھا کہ جاوید مرا پڑا ہے
. . . . پو پھٹ رہی تھی۔ روشندان کے ذریعے اوشا کا پیلا سونا بہہ کر اندر آ رہا تھا۔ شرقی
آسمان میں کرنوں کے لالہ زار کھیت لہرا رہے تھے لیکن جاوید کائنات کی تمام خوبصورتی
سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر مرا پڑا تھا۔ جانے نے گارڈینا کے پھول اپنی انگلیوں میں
مسل ڈالے۔ اور جاوید کی چھاتی پر جھک گئی اور اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں
لینے لگی۔

علی الصباح جب کرسچین جاگا۔ تو اُس نے دیکھا کہ مس جانے اس کی چھاتی پہ
چہرہ اپنے ہاتھوں میں ڈھانپے سو رہی ہیں۔ اس نے اُنہیں آہستہ سے جھنجھوڑا ہیں
صبح ــــــ مس صاحبہ ــــــ پھر وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر پرے ہٹ گیا کنواری جانے
آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں اور آنسوؤں کے دونوں سوتے گالوں پہ بہہ بہہ کر خشک
ہو گئے تھے ۔

محمد شریف عباسی خوشنویس لاہور۔ اگست ۱۹۴۸ء